جاگے ہیں خواب میں کا تاریخی وتہذیبی مطالعہ

(تحقیقی مقالہ برائے ایم ایس اُردو)

مقالہ نگار:

اسلام بہادر

رجسٹریشن:168-FLL/MSURDU/F15

نگران:

ڈاکٹر ارشد محمود آصف (ارشد معراج)

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۸ء

TH23090

MS
891.4393
اس ج

اردو ادب ۔ ناول

" " ۔ تاریخی تجزیہ

جاگے ہیں خواب میں کا تاریخی مطالعہ

(تحقیقی مقالہ)

مقالہ نگار:

اسلام بہادر

رجسٹریشن نمبر:168-FLL/MSURDU/F15

مقالہ برائے ایم ایس (اُردو)

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

یہ مقالہ

ایم ایس (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

کلیۂ زبان وادب

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۸ء

اقرار نامہ

میں،اسلام بہادر، رجسٹریشن نمبر168-FLL/MSURDU/F15 حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد کے ایم ایس (اُردو) سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر ارشد محمود آصف کی نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا۔

Islam bahadar

(اسلام بہادر)

مقالہ نگار

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۸ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

درج ذیل مقالہ شعبۂ اُردو، کلیہ زبان وادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں MS اُردو کی ڈگری کی جزوی منظوری کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ زیرِ دستخطی نے یہ مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے اور MS اُردو کی ڈگری تفویض کرنے کی منظوری دیتے ہیں۔

مقالے کا عنوان:	**جاگے ہیں خواب میں کا تاریخی و تہذیبی مطالعہ**
مقالہ نگار:	اسلام بہادر
رجسٹریشن نمبر:	168-FLL/MSURDU/F15

کمیٹی دفاع مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر ایاز افسر
ڈین
کلیۂ زبان وادب
آئی آئی یو، اسلام آباد

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
صدر
شعبۂ اُردو
آئی آئی یو، اسلام آباد

ڈاکٹر راشد حمید
سیکرٹری، اکادمی ادبیات
اسلام آباد
بیرونی ممتحن

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
اندرونی ممتحن

ڈاکٹر ارشد محمود آصف (ارشد معراج)
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
نگران مقالہ

مارچ، 2019ء

فہرست ابواب

صفحہ نمبر	نام ابواب
ا	پیش لفظ
۱	باب اول: تاریخ اور تہذیب: ایک مطالعہ
۴۷	باب دوم: ناول کا تعارفی و تکنیکی مطالعہ
۱۰۵	باب سوم: ناول کا تاریخی مطالعہ
۱۵۱	باب چہارم: ناول کا تہذیبی مطالعہ
۱۹۰	ماحصل
۱۹۳	کتابیات

پیش لفظ

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان کی ذہنی ترجیحات کا اندازہ اس کے بچپن میں ہوتا ہے اور جس شعبے کی طرف اس کے رجحانات ہیں ایک ذہن شناس استاد کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

پرائمری سے لے کر بارہویں جماعت تک جب میں اپنے ابتدائی تعلیمی مرحلے پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ جان کر خوشی ہوتی ہے کہ شروع ہی سے میں سماجی علوم میں دلچسپی رکھتا تھا اور کالج کے سطح پر آ کر میں سماجی علوم، عمرانیات، ادب، دینیات میں میری دلچسپی اور بھی بڑھ گئی۔ بی، اے کرنے کے بعد جب میں نے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے شعبہ اُردو میں داخلہ لیا تو مجھے بہت خوشی ہوئی کہ میں ایک ایسے شعبے میں آیا ہوں جس میں مذکورہ بالا علوم کی عکاسی ہوتی ہے کیوں کہ ادب زندگی کا عکاس ہے۔

اردو ادب میں دیگر اصناف کے مقابلے میں ناول کا دائرہ زیادہ وسیع ہے اس میں سماجی علوم کے ساتھ ساتھ تہذیبی عناصر کی بھر پور کارفرمائی ہوتی ہے۔ یعنی کسی تہذیب میں لکھا گیا ناول اسی تہذیب کی ایک سچی تصویر ہوتی ہے۔ سو فطری طور پر میرا رجحان ناول کے طرف تھا کیوں کہ ناول ایک ایسی فلم ہے جس ہم ساری تہذیب دیکھ سکتے ہیں۔

ناول کے مطالعہ کا سفر میں نے بانو قدسیہ کے ناول راجہ گدھ سے کیا جس سے میں بہت متاثر ہوا۔ اس کے بعد شوکت صدیقی کا مشہور ناول جانگلوس میں نے پڑھا جس میں سامراجی ذہنیت کی خوب عکاسی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مستنصر حسین تارڑ کا ایے غزالِ شب اور قلعہ جنگی بھی نظر سے گزرا۔ تو اس صنف میں دلچسپی اور بھی بڑھ گئی اور میں نے کئی ملکی اور غیر ملکی ناولوں کا مطالعہ کیا۔ مطالعے کے اس سفر میں اختر رضا سلیمی کا ناول ''جاگے ہیں خواب میں'' جب میں نے مطالعہ کیا تو اس ناول کے انوکھی تکنیک نے مجھے بہت متاثر کیا اور اساتذہ کے مشورے سے میں نے اس کے تاریخی و تہذیبی پہلو کے حوالے سے مقالے لکھنے کا فیصلہ کیا۔

اس مقالے کے چار ابواب ہیں۔ پہلے باب کا عنوان ''تاریخ و تہذیب ایک مطالعہ'' ہے۔ جس میں تاریخ و تہذیب کے حوالے مختلف ناقدین کی آراء پیش کی گئی اور ان کے صحیح مقام کا تعین کیا گیا۔ دوسرا باب ''ناول کا تعارفی و تکنیکی مطالعہ'' اس میں ناول کے سارے موضوعات پر بات ہوئی ہے اور مختلف ناقدین

کے آراء ناول کے حوالے سے اور اس ناول کی تکنیک کے حوالے سے پیش کی گئی ہے۔ تیسرا باب ''ناول کا تاریخی مطالعہ'' ہے۔ اس باب میں ناول کی تاریخی جہت کو واضح کیا گیا ہے۔ کہ اس میں کونسے اہم تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں۔ چوتھا باب ''ناول کا تہذیبی مطالعہ'' پر ہے جس میں ناول کے اندر مختلف تہذیبی عناصر کارفرمائی پر خوب گفتگو ہوتی۔ جس میں گندھارا تہذیب کی جھلک خوب نمایاں تھی جس میں تمدن نے عروج حاصل کیا اور بدھ مت کے تعلیمات کی وجہ سے عدم تشدد کے فلسفے کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ اس کے ناول کے دیگر جہات بھی ہیں جس پر مقالے میں مختصر بات کی گئی ہے یہ دیگر جہات میں دیگر لوگوں کی دلچسپی کے لیے چھوڑتا ہوں کہ وہ اس پر تحقیق کریں اور ان جہات کو واضح کریں۔

آخر میں اپنے نگران محترم ڈاکٹر ارشد معراج کا خصوصی ممنون ہوں جن کی مدد ہر مشکل گھڑی میں میرے ساتھ ساتھ رہی اور ہر لمحے میری رہنمائی کی جن کی بدولت اس مقالے کی تکمیل ممکن ہوسکی۔

اس موقع پر میں اپنے دوسرے اساتذہ کرام کا شکریہ ادا کرنا بھی نہیں بھول سکتا جنھوں نے مقالے کی تسوید کے دوران پیش آنے والی مشکلات میں میری رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا۔خصوصی طور پر ڈاکٹر عزیز ابن الحسن، ڈاکٹر کامران کاظمی ،ڈاکٹر مظہر علی اور ڈاکٹر اسماعیل گوہر کا بہت ممنون ہوں ۔

والدین کا شکریہ بھی لازم ہے جو دن رات میری کامیابی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا گو رہتے ہیں ۔اس کے علاوہ اپنے دوستوں وسیم عباس، علی حسین ،محمد امجد، محمد اسحاق خان کے تعاون کو بھی فراموش نہیں کرسکتا ۔

آخر میں ایک بار پھر اپنے نگران ڈاکٹر ارشد معراج صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور ان کی صحت اور خوشی کے لیے اللہ سے ہمیشہ دعا گو ہوں (آمین)۔

اسلام بہادر

۶ راگست ۲۰۱۸ء

بابِ اوّل

تاریخ اور تہذیب: ایک مطالعہ

الف: تاریخ اور تہذیب

ب: برِعظیم کا تاریخی و تہذیبی منظر نامہ

ج: ادب اور تاریخ و تہذیب کے تصور کا باہمی رشتہ

الف : تاریخ اور تہذیب

تغیر اور زیست کی داستان قدیم اور معاصر ہونے کا درجہ رکھتی ہے یعنی زندگی مسلسل تغیر کے عمل سے دو چار ہونے کی بدولت ہر لحظہ اور ہر لحہ بدلتی رہتی ہے۔ اس میں کہیں بھی سکون اور ٹھہراؤ کا عمل ہمیں نظر نہیں آتا اور زندگی کی اس دور میں ہمیں وہ باتیں یا د رہتی ہیں جو اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ اس بات سے سرِ مو انحراف ممکن نہیں کہ تاریخ کی ابتدا قصے کہانیوں سے ہوئی اس لیے تاریخ میں چند من گھڑت قصوں، بادشاہوں اور بڑے بڑے لوگوں کے حالات و واقعات کو ہی تاریخ سمجھا جاتا تھا لیکن اب تاریخ محض قصے کہانیوں کی رنگین داستان نہیں ہے بلکہ وقت کے ہر لمحے نے تجربے کو پختگی اور شعور کی روشنی عطا کی اور انسان نے ان قصے کہانیوں کو عقلی و تنقیدی کسوٹی پر پرکھنا شروع کیا جو باتیں اس کے معیار پر پوری اتریں وہ تاریخ کا حصہ بن گئیں اور بے معنی اور فضول تفصیلات کو نظر انداز کر دیا گیا اس طرح تاریخ کو انسانی زندگی کے اہم واقعات و حقائق کا نام دیا جا سکتا ہے۔

انسان کی تاریخ اس دنیا میں ہزار ہا سال پرانی ہے لیکن انسان کی تہذیبی تاریخ کم و بیش تقریباً چھ ہزار سال پرانی ہے ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو کر قصۂ پارینہ بننے والے سینکڑوں، ہزاروں سال قدیم تہذیب کے پروردہ لوگوں کے متعلق جاننے کا عمل کوئی آسان کام نہیں۔ ان لوگوں اور تہذیبوں کا مطالعہ جو صفحۂ ہستی سے کب کی مٹ گئیں ناگریز بھی ہے اور مشکل بھی۔ اس بارے میں ڈی ڈی کوسمبی رقم طراز ہیں:

> قبل تاریخ کے لوگ جن کا ہم مطالعہ کرنا چاہتے ہیں روئے زمین سے مٹ چکے ہیں۔ بعض گروہ اپنے بعد ایسے اخلاف چھوڑ گئے ہیں جو آگے بڑھ کر تہذیب حاضرہ تک آ گئے اور بعض صفحۂ ہستی سے یکسر غائب ہو گئے ۔ دور افتادہ گوشوں میں جو تھوڑے سے باقی رہ گئے ہیں انہوں نے کچھ خیالات ذہنی اندازتوہمات ، پوجا پاٹ کے طریقے اور رسم و رواج اس قسم کے پیدا کر لئے ہیں جو ان کی زندگی کے جدید طریقوں کا تجربہ کرنے سے روکتے ہیں۔ ۱

جب بھی مورخ کسی دور کی تاریخ مرتب کرنے بیٹھتا ہے تو وہ اس دور کی پوری زندگی کی تصویر

کھینچنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا اسے تو صرف ان معنی خیز واقعات کو بیان کرنا ہوتا ہے جو اس کی نظر میں مستقبل کی تعمیر میں معاون و مدد گار ہوں ۔ تاریخ سفرِ زیست کے ارتقا کی داستان ہے ،تاریخ ہی کی بدولت ہم ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے ہیں اور بنی نوع انسان کی صدیوں پر محیط تہذیبی ،سماجی،معاشرتی، اور سیاسی زندگی کے متعلق معلومات سے آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ تاریخ اور انسانی کہانی لازم وملزوم ہیں یعنی تاریخ اور زندگی ہمیشہ ہم رکاب رہے ہیں۔تاریخ زندگی کے تجربات کا ایک بہترین ذخیرہ ہے۔ تاریخ یقیناً وجودِ انسانی کے متعلق ہمیں معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ انسان اس وقت سے انسان ہے جب سے وہ یادداشت کی دولت سے مالا مال ہے۔ تاریخ سے ہمیں مختلف انسانوں کی زندگی کے حالات و واقعات مختلف اداروں کی ابتدا اور مختلف تحریکوں سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ تجربات ہمیشہ ہمارے لیے مشعلِ راہ ہوتے ہیں اور ہم اپنی زندگی کو بہتر انداز میں گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ماضی ہمارے لئے منارۂ نور کی مانند ہے۔ ماضی کی کوتاہیوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہم اپنا مستقبل کو شاندار بنا سکتے ہیں۔ ماضی کی اسی داستان میں انسان کی کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ تاریخ ہی کے اوراق اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ وحشت کے دور سے نکل کر انسان نے اپنی دنیا پر قدرت حاصل کرنے کی کوششیں شروع کی تھیں اس کوشش اور جدوجہد میں اسے دشواریوں اور صعوبتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی عزم کے سامنے راستے کا ہر پتھر اور رکاوٹ ختم ہوگئی اور آج اسی ذہنی ارتقا کی بدولت ہم انسانوں کو جو ابتدا میں غاروں میں رہا کرتا تھا اور جسے اپنا تن ڈھانپنے کے لیے درختوں کے پتوں کی ضرورت محسوس ہوئی لیکن اب اس کا سفر چاند کی دنیا تسخیر کرنے کے بعد مریخ کی طرف جاری ہے۔

تاریخ کے مطالعہ سے پوری کائنات کے تجربات کا نچوڑ معلوم ہو جاتا ہے اور ہم ان امور پر پوری توجہ دینے لگتے ہیں کہ وہ کون سے ایسے عوامل ہیں جن کی بدولت اقوام عروج و زوال اور شکست و ریخت سے دو چار ہوئیں یہی عروج و زوال کی داستان ہمیں انسانی زندگی کی تاریخ کی ارتقائی کہانی ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ اسی کہانی میں انسان کے ماضی کے کارہائے نمایاں مضمر ہیں جو ہمیں موجودہ مسائل کو بطریقِ احسن دیکھنے اور حل کرنے کے علاوہ شان دار مستقبل کی بنیاد رکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔

تاریخ اور تہذیب کے پس منظری مطالعے میں اب ہم تہذیب، ثقافت، تمدن اور کلچر کے درمیان فرق کو مختصراً واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بات بھی سچ ہے کہ اہلِ علم اور اربابِ فضل و دانش نے

اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور ذکاوتِ طبعی سے کام لیتے ہوئے با وصف مجردات کی تعریف متعین کرنے میں گا ہے سہواً اور گاہے کثرتِ معنی پیدا کرنے والی اصطلاحات سے کام لے کر مباحث کے در واکیے ہیں خیر، شر، صداقت اور اخلاق کے علاوہ تہذیب، ثقافت، تمدن اور کلچر کے الفاظ کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے اور انہیں ایک دوسرے سے الگ ہونے کے باوجود بھی الگ کر کے دیکھنا ''کارِ مشکل است'' والی بات ہے۔ مندرجہ بالاعنوانات پر بہت سے اہلِ علم و دانش نے اپنی اپنی توضیحات بیان کی ہیں جن کو پڑھنے کے بعد کسی ایک سے متفق ہونا بہت مشکل ہے ہر ایک نے اپنی اپنی سوچ اور فکر کے مطابق بات کی ہے کوئی تہذیب ،ثقافت، تمدن اور کلچر کو مترادفات میں شامل کرتا ہے، کوئی تہذیب کو وسیع اور باقی مذکورہ عنوانات کو ذیلی تفصیلات میں لے کر آتا ہے، کوئی ان سب کے درمیان لطیف سا فرق واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ان عنوانات کی دو جمع دو کی طرح کوئی ٹھوس تعریف ممکن نہیں کیوں کہ کسی بھی چیز کی تعریف الفاظ میں کرنا بس اسی حد تک ممکن ہے کہ اس چیز کو پہچاننے میں مدد تو مل سکتی ہے لیکن پہچان کا سارا دارو مدار محض تعریف پر نہیں مثلاً اکثر اہلِ علم نے جب'' تہذیب'' کی تعریف وتشریح کرنا چاہی تو اسے انسانوں کے طرزِ زندگی کا نام دیا۔

طرزِ زندگی میں لوگوں کا رہن سہن ،فکروفلسفہ ، علوم وفنون ،اصولِ معیشت وسیاست ،شعرونغمہ ،رسوم وعقائد اور زبان وادب سبھی کچھ شامل ہے اور یوں یہ تعریف نہ صرف تہذیب بلکہ تمدن وثقافت پر بھی محیط ہے۔کسی نے تہذیب و ثقافت کے لیے'' کلچر'' کی واحد اصطلاح استعمال کی اور اسے دوقسم کے عناصر یعنی ''مادی و روحانی'' کا مرکب قرار دیا ۔علاقائی، قومی اور ملی کلچر کی تقسیم بھی کی گئی مثلاً پاکستانی تناظرات میں علاقائی ، ذیلی کلچر سے ہم پختون ،سندھی، پنجابی، کشمیری اور بلوچی کلچر مراد لے سکتے ہیں۔قومی کلچر کی حیثیت دریا کی سی ہے جسے علاقائی کلچر کی ندیاں سیراب کرتی ہیں اور بالآخر یہ دریا وسیع تر ملی کلچر میں شامل ہو جاتا ہے جسے سمندر کہہ لیجیے ۔ڈاکٹر جمیل جالبی تہذیب ،ثقافت اور کلچر میں کچھ اس طرح حدِ فاصل کھینچتے ہیں:

> کلچر کے سلسلے میں اب تک ہمارے ہاں دو لفظ استعمال ہو رہے ہیں ان میں سے ایک لفظ تہذیب ہے اور دوسرا ثقافت، تہذیب کا لفظ صدیوں سے نہ صرف ہماری زبان بلکہ عربی اور فارسی میں بھی مستعمل ہے جو شائستگی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جس میں خوش اخلاقی ،اطوار، گفتار اور کردار کی شائستگی شامل ہے جیسے کہا جائے کہ وہ تہذیب یافتہ یا مہذب انسان ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ اطوار و گفتار

میں شائستہ ہے۔ لفظ تہذیب ان چیزوں سے تعلق رکھتا ہے جن کا تعلق ہمارے ظاہر سے ہے ۔ انسان جس طور پر اپنی معاشرت اور اخلاق کا اظہار کرتا ہے وہ اس کی تہذیب ہے۔۔۔۔وہ تمام چیزیں جن کا تعلق ہمارے ذہن سے ہے وہ ثقافت کے زمرے میں آئیں گی۔گویا لفظ تہذیب کا زور خارجی چیزوں اور طرزِ عمل کے اس اظہار پر ہے جس میں خوش اخلاقی، اطوار، گفتار اور کردار شامل ہیں اور لفظ ثقافت کا زور ذہنی صفات پر ہے ۔ تہذیب اور ثقافت کے مجموعے کو کلچر کہیں گے جس میں تہذیب اور ثقافت دونوں کے مفاہیم شامل ہیں اس کے معنی یہ ہوئے کہ کلچر ایک ایسا لفظ ہے جو زندگی کی ساری سرگرمیوں کا خواہ وہ ذہنی ہوں یا مادی، خارجی ہوں یا داخلی احاطہ کر لیتا ہے۔۲

سبطِ حسن ! تہذیب و ثقافت کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

کسی معاشرے کی با مقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں۔تہذیب معاشرے کی طرزِ زندگی اور طرزِ فکر و احساس کا جوہر ہوتی ہے۔ چناں چہ زبان، آلات و اوزار، پیداوار کے طریقے اور سماجی رشتے ، رہن سہن ،فنونِ لطیفہ علم و ادب،فلسفہ وحکمت، عقائد و افسوں، اخلاق و عادات ، رسوم و روایات عشق و محبت کے سلوک اور خاندانی تعلقات وغیرہ تہذیب کے متعلقہ مظاہر ہیں ۔۳

ڈاکٹر سلیم اختر ! دریا اور اس کی لہروں کی مثال پیش کرتے ہوئے تہذیب اور کلچر کے مابین فرق کو اس طرح سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں :

تہذیب اور کلچر میں فرق یہ ہے کہ تہذیب ایک ایسا دریا ہے جس کا منبع کہیں دور ماضی بعید کی تاریکی میں پنہاں ہے اور اسی دریا کے مختلف مقامات پر ابھرتی اور ڈوبتی لہریں کلچر اس دریا سے لہریں بھی نکلتی ہیں اور اس میں نئے دریا بھی شامل ہوتے ہیں یہ مختلف تہذیبیں اور کلچرل اثرات ہیں ہزار روپ بدلنے پر بھی کلچر پانی کی وہ لہر ہی رہے گا جو دریا کا ایک حصہ ہے بہ الفاظِ دیگر ہزار تنوع کے باوجود بھی تہذیب اور کلچر کی اساس ایک ہی ہوتی ہے اور ہونی چاہیے ورنہ عملی زندگی میں تضادات جنم لیتے

ہیں۔[۴]

ڈاکٹر وزیر آغا، تہذیب اور ثقافت کو ایک ہی سکے کے دو رخ قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> تہذیب اور ثقافت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ثقافت تخلیقی رخ ہے اور تہذیب تنقیدی رخ۔ ثقافت فنونِ لطیفہ، سائنس کی دریافتوں اور ایجادات کے علاوہ عام زندگی میں اپج ، تنوع اور روحانی یافت کی صورت میں اپنی جھلک دکھاتی ہے مگر تہذیب مزاجاً رجحانِ نقل کے تابع ہے۔ ۵

تمدن اور تہذیب کے حوالے سے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے سبطِ حسن ہمیں بتاتے ہیں :

> تمدن کی بنیادی شرط شہری زندگی ہے۔ تمدن اسی وقت وجود میں آتا ہے جب شہر آباد ہوتے ہیں ۔دراصل تمدن نام ہی ان رشتوں کی تنظیم کا ہے جو شہری زندگی اپنے ساتھ لاتی ہے خواہ یہ تنظیم انسان کے باہمی رشتوں سے تعلق رکھتی ہو یا انسان اور مادی چیزوں کے باہمی ربط سے وابستہ ہو۔ تحریر کا رواج بھی تمدن ہی کا مظہر ہے کیوں کہ وہ معاشرہ جو فن سے نا واقف ہو مہذب کہا جا سکتا ہے لیکن متمدن نہیں کہا جا سکتا۔ ۶

تہذیب ،تمدن ،ثقافت اور کلچر کے مباحث بہت دلچسپ اور طویل ہیں مگر ان مباحث میں الجھنے کی بجائے ہم یہاں صرف اپنے موضوع ''تاریخ اور تہذیب'' کے حوالے سے اپنی بات کو آگے بڑھائیں گے۔ اب ہم باری باری تاریخ اور تہذیب کے قدیم تصورات و نظریات پر غور و خوض کرتے ہیں ۔

تاریخ کے متعلق قدیم نظریات وقت اور ماحول کے مطابق بدلتے رہے ۔ قدیم نظریہ یہی ہے کہ تاریخ محض پرانے واقعات کا بیان ہے یا مختلف ریاستوں کی سیاست کے قصے ہیں ۔گزشتہ زمانوں میں مورخین نے تاریخ کو محض اپنے نظریات کی ترجمانی کے لیے استعمال کیا جس سے تاریخی حقائق مسخ شدہ شکل میں سامنے آتے رہے ۔ تاریخ سے مراد صرف سنے سنائے قصے کہانیاں تھیں ہم دیکھتے ہیں کہ نہ ان میں کوئی تسلسل تھا اور نہ ہی یہ سلسلہ وار مرتب تھیں اور نہ ہی ان واقعات کے مستند کوئی ماخذ موجود تھے۔

ماضی کی اہمیت اور افادیت کے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ تاریخ ماضی میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا مجموعہ ہے ۔ ماضی حال اور مستقبل ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں ماضی کی بنیادوں پر ہی حال و

مستقبل کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔ ماضی ہی کے اوراق میں انسانی زندگی کی تاریخ پوشیدہ ہے یہی اوراق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ انسان ابتدائے آفرینش سے ہی اپنے خیالات ونظریات کو مرتب کرتا چلا آیا ہے۔

تاریخ مشاہدے کی وسعت، تجربات کی پختگی اور احساس وشعور کو نئی سمتوں سے آشنا کرتی ہے۔ تاریخی واقعات ایک دوسرے کے بطن سے فطری طور پر ابھرتے ہیں خلا میں ایک دوسرے سے الگ وقوع پزیر نہیں ہوتے تاریخ روایاتِ کہن اور نقوشِ پارینہ کا ہی خزینہ نہیں بلکہ ہماری ذہنی وفکری ،جذباتی وتہذیبی اور معاشرتی وثقافتی سفر کی ارتقائی داستان ہے اور اگر فکر وعمل پر تاریخی وتہذیبی روایات کی گرفت کمزور پڑ جائے تو بے یقینی اور انتشار سے سفرِ زیست سست روی کا شکار ہو جاتا ہے۔آج ہمارے کرداراور شخصیت میں جو پسپائیت،بحران اور تضاد نظر آتا ہے اس کی بنیادی وجہ ماضی سے بیزاری،تاریخ سے غفلت،ثقافت سے بیگانگی اور تصورِحقیقت سے دوری ہے یہی وجہ ہے کہ ہم میں تخلیقی اور حقیقی ذوق کمزور پڑ گیا ہے حالاں کہ تاریخ کا بنیادی تعلق تخلیقی واقعات سے جڑا ہوا ہے اس سلسلے میں زوار حسین کی رائے ہے:

> تاریخ کو ایک قبل از تاریخی بے نشان سطح سے اخذ کیا گیا ہے۔ ماضی قدیم کی اس صورتِ حال کے برعکس ، تاریخ کے لیے لازم آیا کہ وہ واقعات کے زمان ومکان کی صحیح طور پر نشان دہی کرے۔حقیقت اور افسانہ کی تفریق کا لحاظ رکھے اور واقعات کی تصدیق کے لیے مشاہداتی ذرائع اختیار کرے۔ تاریخ کا اساسی تعلق انسان کی طرف سے پیدا کردہ تخلیقی واقعات سے ہے۔۷

لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارا ذہنی عمل ایک خاص دائرے پر آ کر رک گیا ہے۔ خیال کی سطح ہموار ہو گئی ہے جیسے ہم ایک جگہ ٹھہر گئے ہوں اور صدیوں سے اسی جگہ ٹھہرے ہوئے ہوں۔ تاریخ سے مجرمانہ تغافل کے نتیجہ میں مسلمانوں کی حکومتیں اندرونی فتنوں اور بیرونی استبداد سے نڈھال ہیں اور اپنے پر شکوہ ماضی کے باوجود غیر مسلم اقوام کی تابع ہیں۔عربوں کی اسلام سے پیشتر ہمیں کوئی ایسی دستاویز نہیں ملتی کہ جسے ہم تاریخ میں شامل کر کے باقاعدہ تاریخ کا عنوان دے سکیں تاہم اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں تاریخ نویسی کا آغاز ہو گیا تھا۔علمِ تفسیر علمِ حدیث،علمِ فقہ اور علم الکلام کے ساتھ ساتھ تاریخ نویسی کو بھی ترقی ملی ۔قرآنِ پاک میں بارہا گزشتہ اقوام کا ذکر آیا ہے اور مسلمانوں کو ماضی کی طرف متوجہ کیا گیا ۔قرآن مجید

نے ماضی کی اہمیت ہمارے سامنے اس طرح پیش کی کہ مسلمان تاریخ کے مطالعے کی طرف راغب ہوں۔ اس مقدس کتاب نے تاریخ کی جزیات سے متعلق اگرچہ کم بحث کی ہے مگر اس میں تاریخ ساز حالات و واقعات اس انداز میں بیان ہوئے ہیں کہ وہ تاریخ کے لیے بہت اہمیت کے حامل ہیں ۔قرآن پاک سچائی کا منبع ہے اور تاریخی واقعات کے لیے ہمیں اس کا ہی سہارہ لینا پڑتا ہے علاوہ ازیں حضرت محمدﷺ نے تاریخ کی اس کھیتی میں ایسے بیج بوئے جن سے ساری کھیتی لہلہا اٹھی اور ساری کائنات کو اپنی خوشبو سے زعفران بنا دیا۔

آپؐ کے خیالات،ارشادات اور نظریات سے ایک عظیم تاریخ نے جنم لیا۔ قصاص کا معاملہ ہو یا غلاموں کے ساتھ حسنِ سلوک کا ۔ہجرتِ مدینہ کی بات ہو یا فتحِ مکہ کی۔شرفِ انسانیت کا ذکر ہو یا سود کا۔ نبی کریمﷺ نے سراپا ظلم و زیادتی پر مشتمل سابقہ تہذیب وتمدن کا خاتمہ کر کے سنہری اصولوں پر مبنی نئی تاریخ رقم فرما دی۔اعلانِ نبوت کے ساتھ ہی اسلام کی نئی تاریخ کا اعلان ہو گیا تھا جس کی تکمیل آپﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع میں فرما دی آپﷺ نے **کونو اعباداللہ اخوانا** کہہ کر بھائی چارے کا درس دے دیا ،**الیوم یوم المرحمۃ** کہہ کر فرما دیا کہ کسی پر کوئی مواخذہ نہیں،کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فوقیت نہیں سوائے تقویٰ اور پرہیز گاری کے ذریعے برابری اور مساوات کا پیغام دے دیا۔خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر ہی آپﷺ نے فرمایا تھا کہ تم لوگ عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو،زمانۂ جاہلیت کے تمام سود پامال ہیں اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کے سود کو چھوڑنے کا اعلان کرتا ہوں،زمانۂ جاہلیت کے ایک دوسرے پر خون پامال ہیں اور سب سے پہلے میں اپنا خون معاف کرتا ہوں۔آپﷺ نے جاہلیت کے کاموں کو رد فرما کر نئے تہذیب وتمدن کی ایک زریں تاریخ رقم فرما دی۔حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع کے موقعے پر ہی ارشاد فرمایا تھا:

''الآ کل شيٍ من امر الجاهلية تحت قدمی''

(ترجمہ)''آگاہ رہو جاہلیت کے کام کی ہر چیز میرے پاؤں تلے روند دی گئی ہے''۔ ۸

تاریخ میں یہی فرمودات ہمارے لیے سرمایۂ حیات،ہماری روح اور ہماری تہذیب ہیں۔آخر میں یہ دیکھنا ہے کہ آخر تاریخ ہے کیا ؟یہ کس کے متعلق ہے؟یہ آگے کیسے قدم اٹھاتی ہے؟چند ایک مورخین کو دیکھتے ہیں کہ وہ تاریخ کے متعلق کیا رائے دیتے ہیں؟۔

۱۔ ''تاریخ انسانی تجربات کی سچی اور حقیقی کان ہے اس لئے اس کا مطالعہ ہمارے لیے اشد ضروری ہے کیوں کہ اس کے ذریعے سے ہم نسلِ انسانی کے تجربوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں''۔ (جانسن)

۲۔ ''تاریخ محض واقعات ہی کا نام نہیں بلکہ ابنِ آدم کی اس طویل اور عجیب و غریب داستان کا نام ہے جو اس کی تخلیق کے ساتھ شروع ہو گئی تھی اور اس کی طوالت کا یہ عالم ہے کہ آج ہزاروں سال گزرنے کے باوجود بھی اس داستان کی تکمیل نہ ہو سکی''۔ (ابوسعید)

۳۔ ''دنیا کی تہذیب و تمدن، عروج و زوال کو ہی تاریخ جاننا چاہیے''۔ (پروفیسر ٹائن بی)

۴۔ ''تاریخ انسان کے ان کارہائے نمایاں کی داستان ہے جو اس نے معاشرہ میں رہتے ہوئے سرانجام دیئے ہوں''۔ ۹ (ہینری پارینا)

گویا انسان کا ہر وہ عمل جو اس نے مہذب معاشرہ میں رہ کر سرانجام دیا ہے تاریخ کی روح ہے۔ انسان کے اسی عمل میں تاریخ کے تمام پہلو آ جاتے ہیں جو انسانی زندگی میں قوتِ محرکہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ تہذیب انسانی کائنات کی اہم ترین اصطلاح ہے لیکن اس کی شرح و تعبیر اس قدر مختلف انداز سے کی گئی ہے کہ بالآخر اس کے اساسی معانی غائب ہو کر رہ گئے۔ تہذیب عربی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی کسی درخت یا پودے کو کاٹنا اور تراشنا تاکہ نئی شاخیں پھوٹیں۔ فارسی میں کسی شے کو آراستہ، پاک اور درست کرنا۔ اردو زبان میں اس کے معانی مہذب، بااخلاق اور شائستہ ہونا، فنونِ لطیفہ کا ذوق اور روایت کا احترام وغیرہ۔ انگریزی زبان میں کلچر کے لغوی معنی ریشم کے کیڑے پالنا، زراعت اور ذہنی اور جسمانی اصلاح و ترقی وغیرہ۔ تہذیب کے متعلق محمد مجیب بتاتے ہیں:

> ہم جسے تہذیب کہتے ہیں اس کے معنی ہیں دین، ایمان کے، دھرم، قانون اور علم کے سائے میں زندگی بسر کرنا اپنی محنت سے اس زندگی کو سرسبز رکھنا، نیک حوصلوں سے اس کو رونق دینا اور صنعت و تجارت کے ذریعے سے وہ چیزیں حاصل کرنا جن سے

آرام پہنچتا ہے۔ہر قوم اپنی زندگی اپنی طبیعت اور مذاق کے ڈھنگ پر بناتی اور سنوارتی ہے"۔۱۰

ہم کسی ملک کی تاریخ پر حاوی نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہم اس کی سیاست کے ساتھ اس کی تہذیب کا مطالعہ نہ کریں۔تہذیب کے معنی ہیں انسان کا اپنی ذہنی اور اخلاقی قوتوں کو تربیت دینا اور انہیں کام میں لانا۔ جماعتوں کی تہذیب ،افراد کی محنت،صلاحیت ،ذوق یا فکر کی پیدا کی ہوئی چیزوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔جماعت کو اپنے منصوبوں اور حوصلوں کو پورا کرنے کا موقع ملتا ہے تو تہذیب پروان چڑھتی ہے ۔انسانی تہذیب میں کسی قوم کا حصہ کم اور کسی کا زیادہ ہوتا ہے۔کوئی قوم تہذیب کی علم بردار ہوتی ہے تو کوئی اپنی نااہلی یا مجبوریوں کی وجہ سے اکثر نعمتوں سے محروم رہتی ہے لیکن ترقی کا سلسلہ بھی برابر جاری رہتا ہے۔ تہذیب کی اعلیٰ قدریں مٹتی نہیں ہیں صرف ان کے حامل بدل جاتے ہیں۔ گھروں میں ان افراد کی پرورش ہوتی ہے جو تہذیب کی داخلی قدروں کے حامل ہوتے ہیں۔رسم ورواج گھروں میں ہی برتا جاتا ہے۔اس لیے خانگی زندگی کو قومی تہذیب کی نبض قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

جب ایک تہذیب معرضِ وجود میں آتی ہے تو اس کی افزائش خودبخود نہیں بڑھتی بلکہ بسااوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک تہذیب معرض وجود میں آئی لیکن وہ نشو ونما نہ پاسکی لہٰذا تہذیب کا معرضِ وجود میں آنا اور نشوونما پانا دو علیحدہ علیحدہ منازل ہیں اور پھر یہ بات بھی عین فطرت کے مطابق ہے کی ہر وہ ادارہ یا تہذیب جس کی بنیاد انسانی ذہن نے رکھی ہے اسے ایک دن زوال پذیر ضرور ہونا ہے یعنی "ہر کمالے راز والے" والی بات صادق آتی ہے ۔ ادارہ یا تہذیب بھی ایک فرد کی طرح مختلف منازل سے ہو کر گزرتے ہیں جس طرح ایک فرد میں بچپن جوانی اور بڑھاپا آتا ہے بالکل اسی طرح ایک تہذیب کو بھی انہی ادوار میں سے گزرنا پڑتا ہے ۔تہذیبوں کے مطالعے میں وہ سنگِ میل کے نشانات کی طرح ہیں ۔قدرت کا اصول تہذیب وفرد کے لیے ایک جیسا ہے اس لیے فرد کی طرح تہذیب کو بھی ایک دن زوال پذیر ہونا ہے۔ تہذیب کی نشو ونما ، ارتقا اور آغاز کے متعلق جاننے کی کوشش کرتے ہیں ۔

تاریخ کے زمانے کے آغاز سے پہلے ہی انسان غیر مہذب سے مہذب حالت میں داخل ہو چکا تھا ۔ پتھر کے زمانے سے دھات کے زمانے تک ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے جو تہذیب کی نشو ونما کے لیے ضروری تھے۔ انسانی قبائل خانہ بدوشی چھوڑ کر زرخیز علاقوں میں بسیرا کرنے لگے تھے۔ وادیٔ نیل ،

وادیٔ دجلہ وفرات اور وادیٔ سندھ وہ وادیاں تھی جہاں سب سے پہلے بستیاں بسائی گئیں اور کاشت کاری ان کا پیشہ ٹھہرا تہذیب و تمدن کا ارتقااورنشو ونما جن وادیوں سے شروع ہوئی ان میں تین باتیں مشترک تھیں:

> ا۔ ان علاقوں میں زمینیں زرخیز تھیں اور یہاں پانی کی فراوانی تھی جس کی وجہ سے اناج اور غلہ کی کاشت آسانی سے کی جا سکتی تھی۔۲۔ ان علاقوں کی آب و ہوا معتدل تھی یہ علاقے بہت زیادہ سرد تھے اور نہ بہت زیادہ گرم ۔۳۔یہ علاقے پہاڑوں یا ریگستانوں کے درمیان میں تھے اس لیے بیرونی حملہ آورں سے بہت عرصہ تک محفوظ رہے اور یہاں جولوگ آباد ہو گئے تھے انہیں کچھ عرصہ امن وامان کی زندگی بسر کرنے کا موقع مل گیا تھا جوتہذیب کے ابتدائی مراحل طے کرنے کے لیے ضروری تھا۔۱۱

ان وادیوں میں تہذیب کی ابتدا کاشت کاری سے ہوئی۔ زمین کاشت کرنے کے لیے گاؤں بسائے گئے اس طرح ان کے اندر اجتماعی بہبود کا شعور پیدا ہوا۔ اجتماعی بہبود کی ذمہ داری خاندان یا قبیلے کے بزرگ پر ڈالی گئی اور اس کے احکامات کو مانا جانے لگا اور اس طرح اس کی حیثیت حاکم کی سی ہو گئی۔ضروریاتِ زندگی جب بڑھنے لگیں اور ان کو پورا کرنے کے لیے دیگر پیشے اختیار کیے جانے لگے پھر آہستہ آہستہ گاؤں شہروں میں تبدیل ہو گئے اور شہری حکومتیں قائم ہوگئیں۔قوموں کو مہذب بنانے میں مذہب اورفنِ تحریر نے بھی بہت حصہ لیا۔ مذہب اورفنِ تحریر میں ارتقائی عمل مسلسل جاری رہا اور اس طرح معاشرتی ترتیب سے تہذیب اور تخلیق کوفروغ ملا:

> تہذیب وہ معاشرتی ترتیب ہے جو ثقافتی تخلیق کوفروغ دیتی ہے۔چار عناصرمل کر تہذیب کومتشکل کرتے ہیں۔ معاشی بہم رسانی ،سیاسی تنظیم، اخلاقی روایات اورعلم وفن کی جستجو۔۱۲

مذکورہ بالا خاندان اور قبائل نے بتدریج سیاسی ، مذہبی، سماجی اور تہذیبی حوالوں سے ترقیاں کیں۔ جنھوں نے اپنے تجربات سے اور اپنے کارناموں سے دنیا کی تہذیبی اور تمدنی ترقی میں وہ حصہ لیا جو تاریخ نے ان کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ یہ قدیم قومیں اور ملک اگر ترقی پذیر نہ ہوتے تو ہم جہاں

ہیں وہاں نہ ہوتے۔ پتھر کے زمانے سے ایٹم بم کے زمانے تک انسان مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن ہی رہا ہے اور تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ انسان آئندہ بھی ترقی ہی کرتا رہے گا اور اس طرح تہذیبیں پنپتی رہیں گی اور تاریخ بنتی رہے گی۔

ب: برعظیم کا تاریخی و تہذیبی منظر نامہ

بنی نوع انسان کی زندگی کے سفر کے ارتقا کی کہانی بہت قدیم اور طویل ہے کیوں کہ تلاش وجستجو انسانی فطرت کا خاصہ ہیں اسی لیے ماہرین بشریات اس تلاش وجستجو میں ہمیشہ سے سرگرداں رہے ہیں اور جب انسان اپنی جبلت سے مجبور ہو کر جن حقائق سے پردہ اٹھانے میں کامیاب ہوتا ہے وہی حقائق انسان کی ارتقائی و ثقافتی تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں۔انسان کی معاشرتی اور معاشی ترقیاں اس کی تہذیب و ثقافت کی کہانیاں،اس کے علوم اور مذاہب کے کارواں اور خود اس کے عروج و زوال کے واقعات تاریخ کے ذریعے ہی ہم تک پہنچے ہیں اسی لیے تاریخ کا مطالعہ ہمیں انسان کی اس جدوجہد سے روشناس کراتا ہے جو اس نے زمانہ ماقبل تاریخ سے لے کر اب تک کی ہے۔

ہر وہ واقعہ جو اپنی اہمیت کی بدولت ناقابلِ فراموش بن جائے تاریخ کی میراث بن جاتا ہے۔ تاریخ میں نہ صرف واقعاتِ گزشتہ ہوتے ہیں بلکہ تاریخ حال اور مستقبل کے لیے آئینہ بھی ہے کہ ہر حال اور مستقبل کا ماضی میں تبدیل ہو کر تاریخ کی میراث بن جانا ایک لازمی امر ہے اور تہذیب کی میراث ایک نسل سے دوسری نسل میں، ایک ملک سے دوسرے ملک میں اور ایک قوم سے دوسری قوم میں منتقل ہونے لگی ۔تہذیب کے قافلے کا یہ سفر تاریخ کا موضوع ہے۔کہانیوں اور افسانوں سے زیادہ دلچسپ اور سبق آموز تہذیب کی تاریخ افراد یا بادشاہوں کی تاریخ نہیں بلکہ پوری انسانیت کی تاریخ ہے۔ایک قوم کا زوال دوسری قوم کے عروج کا باعث بنا اور ایک سلطنت کا انحطاط دوسری سلطنت کی ترقی کا سبب بنا۔تہذیب کا یہ قافلہ چلتا رہا اور اب تک چل رہا ہے۔ برِعظیم بالکل ابتدائی زمانے سے دینی اور اخلاقی تصورات کی آماج گاہ اور مختلف تہذیبوں کی کشمکش کا میدان رہا ہے ۔ یہاں کئی تہذیبیں تکمیل کو پہنچ کر زوال پا چکی ہیں، یہاں ایسی سلطنتیں بھی قائم رہ چکی ہیں جن کی شہرت اور اثر مشرقی اور مغربی ایشیا میں دور دور تک تھا اور دوسری طرف یہاں صدیوں تک ایسی بدنظمی بھی رہی ہے کہ ایک دنیا اس پر متعجب تھی کہ یہاں عروج و زوال ،تنظیم و انتشار کے امکانات جیسے کہ پہلے تھے اب بھی موجود ہیں۔

مختلف تہذیبوں کے مطالعہ سے پہلے وادیٔ سندھ کی تہذیب کے معنی ومفہوم کے ساتھ ساتھ ہمیں اس کی وسعت اور دائرہ کار بھی متعین کرنا ہوگا تا کہ ہم صحیح ڈگر پر چلتے ہوئے اپنی منزلِ مقصود تک رسائی حاصل کر سکیں۔ محمد رفیق مغل بتاتے ہیں:

> علمی وفکری لحاظ سے وادیٔ سندھ کی تہذیب کے معنی یہ ہیں کہ اس تہذیب میں محض صوبہ سندھ کے ہی قدیم علاقے شامل نہیں ہیں بلکہ دیگر کئی ایک صوبوں کے اہم خطے بھی اس میں شامل ہیں جو مختلف پہلوؤں اور گوشوں کے لحاظ سے یکسانیت کے حامل ہیں وادیِ سندھ کی تہذیب، سندھ اور مغربی پنجاب کے علاوہ صوبہ سرحد اور جنوبی بلوچستان کے علاقوں تک پھیلی ہوئی ہے اس کے اثرات بھارت کے کچھ شہروں مثلاً جالندھر، امرتسر، فیروز پور، ہریانہ، راجستھان اور صوبہ گجرات تک محسوس کیے جا سکتے ہیں۔۱۳

بیسویں صدی کے اوائل تک یہ خیال عام تھا کہ برعظیم پاک و ہند میں تہذیب کی بنیادیں آریائی لوگوں نے ۲۰۰۰ء ق م میں رکھی تھیں اور انہوں نے برعظیم کی پہلی مہذب قوم کی حیثیت سے برعظیم کی تاریخ کا آغاز کیا تھا لیکن برعظیم کے محکمہ آثارِ قدیمہ کے ماہرین ۱۹۲۲ء میں ایک ایسی تہذیب کے آثار دریافت کرنے میں کامیاب ہوئے جو برعظیم میں آریاؤں کی آمد سے تقریباً پندرہ صدیاں قبل وادیٔ سندھ میں ترقی کی مختلف منازل طے کر چکی تھی اور جو سومیری اور بابلی تہذیب کی معاصر اور ہمسر تہذیب تھی۔ یہاں ان قدیم باشندوں کی بستیاں آباد تھیں جنہوں نے تقریباً ۴۰۰۰ء ق م میں اس علاقہ میں آ کر سکونت اختیار کر لی تھی۔

ہڑپہ اور موہنجوداڑو کی دریافت سے اس قدیم تہذیب کے متعلق اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ جب ہم قبل از تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو بعض اوقات ہزار کوشش کے باجود یقینیت پر امکانیت کے اثرات غالب رہتے ہیں کیوں کہ ابھی تک صحیح طور پر یہ بات نہیں معلوم ہو سکی کہ وادیٔ سندھ میں جو لوگ آباد ہوئے تھے وہ کس نسل سے تعلق رکھتے تھے اور کس علاقے سے آئے تھے؟ یوں بھی خیال کیا جاتا ہے کہ مختلف نسلوں کے لوگ یہاں آ کر آباد ہو گئے اور کئی صدیوں تک انہوں نے اس مشترک تہذیب کی نشوونما کی جسے بعد میں وادیٔ سندھ کی تہذیب کا نام دیا گیا اور جس کی دریافت نے

ہندوستان کی تاریخ میں ایک انقلاب پیدا کردیا۔موہنجوداڑو (صوبہ سندھ) اور ہڑپہ (صوبہ پنجاب) کے شہر مٹی کے ٹیلوں کے نیچے سے برآمد کیے گئے ہیں۔موہنجوداڑو اور ہڑپہ کے درمیان تقریباً چار ،ساڑھے چار سومیل کا فاصلہ ہے لیکن اس کے باوجود دونوں شہروں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ دونوں شہر ایک ہی زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں ایک ساتھ ہی تہذیب کی نشوونما ہو رہی تھی۔اس سلسلہ میں محمد مجیب کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

> موہنجوداڑو صوبہ سندھ کے ضلع لاڑکانہ میں ہے، ہڑپہ پنجاب کے ضلع منٹگمری میں، دونوں کے درمیان ساڑھے چار سومیل کا فاصلہ ہے لیکن دونوں کے تمدن میں حیرت انگیز یکسانی ہے۔دونوں کے مکانات ایک طرح کے نقشے پر، ایک طرح کے مسالے سے بنے ہیں، ان کے اوزار، برتن ہتھیار، زیور، مہریں سب ایک سی ہیں ان دونوں شہروں کی تہذیب ارتقا کے ایک لمبے سلسلے کی تکمیل تھی، ایک سی طبیعت، مذاق، رسم و رواج اور عقیدے رکھنے والے لوگوں کی تہذیب تھی اور وہ انہی دوشہروں کی خصوصیت نہیں تھی بلکہ ایک وسیع علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔۱۴

موہنجو داڑو (Mohenjodaro) اور ہڑپہ (Harappa) جیسے شہروں کی بناوٹ ،گلیوں ،سڑکوں اور عمارتوں سے تہذیب کی اس ترقی کا پتہ چلتا ہے جو وادیٔ سندھ کے لوگوں نے کی تھی۔ یہ شہر بہت عمدگی، طریقے سلیقے اور ہنر مندی سے آباد کیے گئے تھے معلوم ہوتا ہے عہدِ جدید میں بنائی جانے والی رہائشی کالونیوں کی طرح پہلے ان شہروں کے نقشے تیار کئے گئے اور پھر ان نقشوں کے مطابق یہ شہر بسائے گئے۔ شہروں میں پھیلی ہوئی گلیاں ترتیب دیئے ہوئے بازار، کشادہ سڑکیں اور پختہ مکانات اس بات کی دلیل ہیں کہ وادیٔ سندھ کے قدیم باشندے مہذب اور شہروں کے بسانے کے طریقوں سے پوری واقفیت رکھتے تھے اور دیگر متعلقہ بسنے بسانے کی ضروریات سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔

قدیم بستیوں اور شہروں کی بناوٹ سے ان کے بلند معیارِ زندگی کا پتہ چلتا ہے اور وہ نالیاں جو گندے پانی کے اخراج کے لئے استعمال ہوا کرتی تھیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ لوگ نہ صرف حفظانِ صحت کے اصولوں سے واقف تھے بلکہ نفیس اور مہذب بھی تھے۔موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی کھدائی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ شہر صدیوں تک آباد رہے اور اس عرصہ میں کئی مرتبہ اجڑے اور بسائے گئے۔ ان کی

عمارتیں جن اینٹوں اور گارے سے بنی ہوئی تھیں دو مختلف زمانوں سے تعلق رکھتی ہیں ۔ عمارات کی ایک بنیاد پر دوسری بنیاد رکھی گئی تھی اور اس طرح ان عمارات کے کئی طبقات دریافت ہو چکے ہیں ۔ شہر کی عمارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر کی آبادی دو علیحدہ علیحدہ علاقوں میں آباد تھی ایک علاقہ تو وہ تھا جہاں شہر کے عام باشندے رہتے تھے اور ان کے پختہ مکانات تھے۔ دوسرا علاقہ وہ تھا جہاں شہر کا حکمران طبقہ رہائش پذیر تھا اس علاقہ کی عمارتیں کشادہ اور وسیع تھیں۔

اگر ہم وادیِ سندھ کی ترقی ، عروج اور تہذیب کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ ہمیں وہاں عالی شان شہر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے دو، دو تین، تین منزلہ اونچے ، پختہ اور مضبوط مکانات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ جنوبیِ عراق اور سندھ کے وہ آثارِ قدیمہ جو زیادہ گہرائی پر ملے ہیں وہ سب سے زیادہ ترقی کا پتہ دیتے ہیں یعنی جب یہاں کے شہر پہلے پہل بنے تب یہاں کی تہذیب عروج پر پہنچ چکی تھی اور بعد میں اسے مسلسل زوال ہی ہوتا رہا۔ جنوبیِ عراق کی سومیری تہذیب کا جس زمانے میں سراغ ملتا ہے اس وقت سومیری دھاتوں کی چیزیں بنا لیا کرتے تھے۔ وادیِ سندھ کی تہذیب کے بارے میں قدیم نظریات کے متعلق سرجان مارشل کہتے ہیں :

> موہنجوداڑو کی نقاب کُشائی ۱۹۲۸ء تک دُنیا کے ماہرینِ آثارِ قدیمہ کا عام خیال یہ تھا کہ وادیِ سندھ کے قدیم باشندے تہذیبی لحاظ سے آرین فاتحین سے حد درجہ پست تھے۔ اُن کی مثال بالکل ھیلوٹز کی تھی اور وہ آرین سپارٹن یا بازنطینی تھے اور یہ لوگ ان کے غلام تھے یوں بھی آرین فاتحین نے ہندوستان کے قدیم باشندوں کو کچھ اس درجہ حقارت بخشی تھی کہ اُن کا نام ہی درسیو یا غلام بن غلام پڑ گیا تھا۔۱۵

ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتابوں ، خاص طور پر رگ وید میں وہاں کے لوگوں کی جو تصویر عیاں ہوتی ہے اس کے مطابق:

> یہ لوگ کالے کلوٹے، چپٹی ناکوں والے، بربروں کی طرح تھے۔ جو گوری رنگت کے آرین سے جسمانی ساخت کے اعتبار سے بھی، ہیچ تر تھے، لسانی اور مذہبی اعتبار سے بھی کم تر۔ دوسری جانب یہ لوگ گائے ، بیلوں بکریوں اور بھیڑوں کے مالک تھے اور ان کے پاس یہ دولت کافی تھی یہ اچھے لڑنے والے بھی تھے اور کئی قلعوں کے مالک

بھی تھے۔جن کے اندر محصوررہ کر وہ حملہ آوروں سے دفاع کرتے تھے۔ ویدک علما نے ان قلعوں کی جو تعریف بیان کی ہے اس کی رو سے یہ قلعے وقتی دفاع کے قابل تو تھے لیکن کچھ زیادہ محفوظ نہ تھے۔ چوں کہ آرین خود بھی کسی بڑی تہذیب و تمدن کے حامل نہ تھے وہ خانہ بدوشوں کی طرح شہروں میں داخل ہوئے تھے اور ان کی زندگی بھی بدویانہ (دیہی) نوعیت کی تھی۔اس لیے یہ تسلیم کر لیا گیا کا ان کے مفتوح بھی کچھ زیادہ مہذب نہ تھے۔۱۶

موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی دریافت اور جدید نظریات کے متعلق سر جان مارشل بتاتے ہیں:

یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ رگ وید کے زمانے کے یہ حقیر تر لوگ ایک یا دو ہزار سال قبل نہیں بلکہ پورے پانچ ہزار سال قبل کے عہد میں سندھ اور پنجاب کے باشندے تھے۔یہ انتہائی مہذب اور اعلیٰ درجہ کی متمدن زندگی گزارتے تھے۔تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے نہ صرف اپنے ہم عصری اور عراقی تمدن کے ہم پلہ تھے بلکہ بعض اعتبار سے ان پر سبقت بھی لے گئے تھے۔ یہ حقیقت دُنیا کو صرف مو ہنجو داڑو اور ہڑپہ کے آثار و باقیات کے چہرے سے تہ بہ تہ پردے ہٹنے کے بعد معلوم ہوئی۔۱۷

ہڑپہ اور موہنجوداڑو جیسے قدیم شہر کبھی آباد تھے۔یہ راز ۱۹۳۲ء سے پہلے کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔کبھی کبھی اس جگہ سے جس کی سطح نے ہڑپہ کو اپنے نیچے چھپا رکھا تھا۔بعض مہریں ملتی رہتی تھیں اور خیال ہوتا تھا کہ اس جگہ کچھ قدیم آثارات و باقیات مدفن ہیں۔بلا شبہ یہ مہریں ماہرینِ آثارِ قدیمہ کے نزدیک بہت قدیم عہد کی غمازی کرتی تھیں۔سر الیگزنڈر کنگھم تو ان مہروں پر کندہ تصویری نقوش نُما،رسم الخط کے بارے میں یہ رائے رکھتے تھے:

ہندوستان کا برہمی رسم الخط اسی تصویری نقوش نُما رسم الخط سے نکلا ہے موہنجوداڑو کے بارے میں بھی ماہرینِ آثارِ قدیمہ کو صرف اس قدر معلوم تھا کہ اس کی سطح کوئی ستر فُٹ اُونچی ہے اور وہاں قدیم سندھیوں کی کوئی عبادت گاہ کبھی بنی تھی۔۱۸

ہم ٹیکسلا کو بھی دنیا کے عظیم تہذیبی ورثے کے طور پر شمار کر سکتے ہیں۔سر جان مارشل کا خیال ہے:

> ہوسکتا ہے کہ ٹیکسلا پانچ سو قبل مسیح سے بھی پہلے آباد ہوا ہو اور اس کا زمانہ وہی ہو جو موہنجو داڑو یا ہڑپہ کا ہے۔ٹیکسلا کو تاریخی لحاظ سے یہ اعزاز حاصل ہے کہ چندر گپت موریہ نے اسی شہر میں اپنی عظمت و بزرگی کا چراغ پہلی بار روشن کیا۔ چندر گپت کے ساتھ وادیِ گندھارا ،وادیِ سندھ اور پنجاب کے لوگ شریک تھے۔ٹیکسلا چندر گپت بند سرو اور اشوک کے عہد میں دُنیا کا تیسرا عظیم ترین شہر تھا۔ جاتکہ بدُھ کہانیوں میں یہ دعویٰ موجود ہے کہ مہاتما بدُھ کی پیدائش سے بھی پہلے ٹیکسلا علوم و فنون کا بہت بڑا گہوارہ تھا۔ بھارت اور اتر پردیش کے شہزادے بڑی تعداد میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے یہاں آتے تھے۔ٹیکسلا نو سو سال قبل مسیح سے علم و آگہی اور فن و تہذیب کا گہوارہ تھااور وہاں وقت کے سب سے بڑے اساتذہ موجود تھے اور پورے ملک کے شہزادے خواہ وہ مخالف گروہ سے تعلق رکھتے تھے اعلیٰ تعلیم کے لیے ٹیکسلا آتے۔۱۹

ٹیکسلا کی قدیم ترین آبادیوں میں ''بھڑ''، ''سرکپ'' اور''سرسکھ''ہیں۔ساتویں صدی عیسوی میں مہاراج برش کے زمانۂ حکومت میں ٹیکسلا میں سینکڑوں بُدھ سٹوپے اور خانقاہیں آباد تھیں ۔سر جان مارشل کا یہ دعویٰ بھی کچھ غلط معلوم نہیں ہوتا ہے:

> خانقاہوں کی زیادہ تر تعمیر پہلی،دوسری،اور تیسری صدی میں ہوئی ۔البتہ سٹوپے مہاراج اشوک کے زمانہ ہی میں خاصی تعداد میں بننے لگے تھے ۔ قدیم ٹیکسلا شاہ ڈیری کی جگہ پر تھا کیوں کہ اس جگہ سے کھدائی کے دوران پچپن ۵۵ سٹوپے ، ۲۸ خانقاہیں اور ۹ مندروں کے آثار ملے ہیں۔۲۰

مختلف ادوار میں مختلف حکمرانوں نے ٹیکسلا پر حکمرانی کی اور مقامی ثقافت و آرٹ پر اپنی ثقافت و آرٹ اور فنِ تعمیر کے کچھ نہ کچھ اثرات بھی مرتب کرتے رہے اس طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ٹیکسلا کی تاریخ نہ صرف ٹیکسلا کی تاریخ ہے بلکہ ہم اسے برِعظیم کی تاریخ سے موسوم کر سکتے ہیں۔ ماہرین آثارقدیمہ ''ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں'' کے مصداق ہمیشہ سرگرداں رہے ہیں کہ موہنجوداڑو ، ہڑپہ اور

ٹیکسلا وغیرہ کی دریافت اور کھدائی کے بعد مزید مخفی تہذیبوں اور نشانات کو برآمد کیا جائے۔ چناں چہ محکمہ آثارِ قدیمہ کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر ایف۔ اے خان نے اپنی زیرنگرانی ۱۹۵۵ء میں خیرپور شہر سے ۲۵ کلومیٹر جنوب کی جانب کوٹ ڈجی (KoT DIJI) کے مقام پر کھدائی کا سلسلہ شروع کیا اور ایسی اشیاء برآمد کیں جو ہڑپہ اور موہنجوداڑو سمیت وادیٔ سندھ کے دیگر قدیم مقامات کی ابتدائی تہوں سے ملنے والی اشیاء کے مشابہ تھیں۔ یہاں سے ملنے والے برتن اور دوسری چیزیں، عروج یافتہ ہڑپائی دور سے بھی پہلے کی ہیں۔ کوٹ ڈجی میں جونئی دریافتیں ہوئیں ان میں قلعہ مکانات، برتن اور پتھر کے اوزار اور ہتھیار قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی ساخت اور بناوٹ سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ شہر وادیٔ سندھ کے ان شہروں میں تھا جہاں تمدنی زندگی کا آغاز ہوا تھا اور جو بعد میں موہنجوداڑو اور ہڑپہ کے شہروں کی شکل میں اپنے کمال تک پہنچ گئی تھی۔ کوٹ ڈجی کی بناوٹ، قدامت، تہذیب اور طبقات کے متعلق رائے ملاحظہ فرمائیں:

> شہر کی بناوٹ اس کی بنیادوں کے گیارہ طبقات (جب کہ موہنجوداڑو کی عمارتوں کے صرف سات طبقات دریافت ہوئے ہیں) اور پتھر کے اوزار اور ہتھیار یہ ثبوت بہم پہنچاتے ہیں کہ کوٹ ڈجی کا شہر، موہنجوداڑو اور ہڑپہ سے بھی قدیم تھا۔ سائنسی تحقیق کے نتیجے میں انسان کوٹ ڈجی میں ۳۱۵۵ء ق م سے لے کر ۲۵۹۰ء ق م کے بین بین آباد رہا اور یہاں کی تہذیب ۳۰۰۰ء ق م میں اپنے انتہائی عروج پر تھی اور غالباً کوٹ ڈجی کے لوگوں سے ہی موہنجوداڑو اور ہڑپہ کے لوگوں نے شہروں کی ترتیب اور بناوٹ سیکھی تھی، ماہرین آثارِ قدیمہ نے جہاں وادیٔ سندھ کے بہت سے اہم شہروں کو دریافت کیا وہاں چھوٹے چھوٹے بے شمار تہذیبی مراکز کا بھی پتہ چلایا مثلاً موہنجوداڑو، ہڑپہ ٹیکسلا، کوٹ ڈجی، کے علاوہ ملتان جلیل آباد چھو دڑو، بالا کوٹ، سوتکا کوہ، گھا گرہ، ہاکڑہ، ٹوچی، مزینہ دمب، سیاہ دمب، پٹھانی دمب، علی مُراد، گنویری والا، ستکاجن، کونری، دابر کوٹ، لوتھل، این جی موجمدار، کالی بنگن، سدھانہ والہ، الہ دینو، غازی شاہ، بگٹ، باہو پور، چلہارو، سالار پور اور فتح پور گوجرہ وغیرہ۔ ۲۱

ان تہذیبوں کی کھوج اور دریافتوں کا سلسلہ چوں کہ جاری و ساری ہے اس لیے اس تلاش اور کھوج میں مزید اضافہ خارج از امکان نہیں مثلاً ایک تاریخی اور تحقیقی مقالے میں ان سائٹس کی تعداد کے متعلق کچھ

اس طرح نشان دہی کی گئی ہے:

> ۱۹۴۸ء میں سر مورتمر وھیلر نے انڈس سولائزیشن کی تقریباً (۱۰۱) سائٹس شمار کی تھیں اور جب کہ ڈاکٹر رفیق مغل نے چولستان میں دریائے ہاکڑہ کی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ (۴۲۴) مقامات کا پتہ چلایا ہے۔ ۱۹۸۰ء میں بین الاقوامی آثارِ قدیمہ کے نزدیک جمع شدہ اعداد و شمار کے مطابق ان کی تعداد (۲۵۰) اور ۱۹۸۲ء میں (۳۰۰) شمار کی گئی اس کے علاوہ بنوں اور گومل کے میدانوں میں بھی مزید نئی سائٹس دریافت کی گئی ہیں۔ ان اعدادو شمار کی تعداد میں ممکن ہے کہ آئندہ برسوں میں مزید اضافہ ہو جائے۔۲۲

کوئی بھی معاشرہ، تہذیب یا کچھ بھی اور، جو بامِ عروج تک پہنچے گا زوال اس کا مقدر ضرور ہو گا کیوں کہ یہ عروج و زوال ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جس طرح علامہ محمد اقبال نے کہا تھا کہ ''ہر وہ چیز خوبصورت ہے جس کو زوال ہے'' بالکل اسی طرح جس چیز پر بھی زوال آتا ہے اُس پر عروج ضرور رہ چکا ہوتا ہے۔ اب چوں کہ ہمارا موضوع تاریخ و تہذیب کے متعلق ہے اس لیے ہم اپنے موضوع کے حوالے سے ہی بات کو آگے بڑھائیں گے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تہذیبیں کیوں زوال پذیر ہوتی ہیں؟ اس سوال کے جواب میں رابرٹ بریفالٹ نے تہذیبی نشو و نما، عروج و زوال کو سیاست، بربریت اور تہذیبی اشتراک و استفاد سے منسلک کرتے ہوئے لکھا ہے:

> کوئی سا مہذب ترین معاشرہ بھی دوسرے مہذب معاشروں سے آزادانہ و متواتر ارتباط کے بغیر نشوونما نہیں جاری رکھ سکتا۔ ہر عظیم تہذیب خواہ وہ یونانی ہو یا رومی عربی ہو یا یورپی، جتنی وسیع ہوتی گئی اسی قدر زیادہ مفید اور قابل قدر ہوتی گئی نیز جس تہذیب میں کہولت، انحطاط بدعنوانی اور زوال و تباہی کا میلان پایا جائے اس کا مطلب یہی ہے کہ اس میں دروغ گوئی اور بد دیانتی راہ پا گئی ہے اور تہذیب کے پھیلاؤ کی جگہ جھوٹ، منافقت اور کرپشن اس کی بقا کے لیے اصل خطرہ ہے۔۲۳

اب ہم عمومی نقطۂ نظر سے تخصیص کی طرف آتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وادیِ سندھ کی تہذیب کا زوال و خاتمہ کیونکر ہوا؟ وہ صنعت و حرفت آثاریات، فنون، دستکاریاں، تحریر اور اس تہذیب کی تباہی کیسے

ممکن ہوئی ؟ آیا یہ زوال اندورنی خلفشار کی بدولت معرضِ وجود میں آیا یا بیرونی اسباب اس کا باعث بنے؟ آیئے مذکورہ بالا تمام باتوں پر غور و خوض کرتے ہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی بھی تہذیب کی تباہی و بربادی کو کسی ایک عمل سے منسوب نہیں کیا جاسکتا بلکہ بہت سے اندرونی اور بیرونی عوامل ایسے ہوتے ہیں جن میں سے کچھ فوری اور دور رس وجوہات کی حیثیت سے اس کی کمزوری میں حصہ لیتے ہیں جس طرح یہ بات ابھی تک واضح نہیں ہوسکی کہ وادیِ سندھ کی تہذیب کس طرح معرضِ وجود میں آئی تھی؟ بالکل اسی طرح یہ بات بھی ایک راز کا درجہ رکھتی ہے کہ اچانک یہ تہذیب کس طرح ملیامیٹ ہوگئی؟

ہڑپہ ،موہنجو داڑو،ٹیکسلا،کوٹ ڈجی اور وادیِ سندھ کے دیگر بہت سے شہر صدیوں بعد زمین سے برآمد کئے گئے مگر جس طرح ان شہروں کی کھدائی کر کے ان کو برآمد کیا گیا اور جس حالات میں وہ پائے گئے اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ شہر یک قلم نیست و نابود ہو گئے۔جیسے ان شہروں پر کوئی مصیبت نازل ہوئی تھی۔ بہت سے مُردوں کے ڈھانچے اس بات پر دلالت کرتا ہیں کہ ان سب کی موت ایک ساتھ واقع ہوئی ہوگی ایسا دیکھ کر قدرتی آفات کا خیال فوراً ذہن میں آتا ہے ۔ممکن ہے یہ تباہی کسی طوفان ،معاشی بحران ،وبا یا زلزلہ کی بدولت ہو جس نے پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو۔غرض یہ کہ وادیِ سندھ کے لوگ ۲۴۰۰ء ق م کے قریب کسی ایسے ہی حادثے یا سانحے کا شکار ہوئے جس نے ان کا نام و نشان مٹا دیا اور وہ صدیوں دنیا کی نظروں سے اوجھل رہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ آبادیاں سیلاب کی نظر ہوگئی ہوں۔زیادہ تر یہ علاقے اور شہر دریاؤں کے قریب واقع تھے کیوں کہ زندگی کا وجود دریاؤں کے قریب ایک لازمی امر تھا۔اس ضمن میں دریا کی سطح تدریجاً بلند ہونے اور بستیاں زیرِ آب آنے یا دریائے سندھ کی طغیانیوں اور بڑے پیمانے پر سیلاب کی تباہ کاریوں کو اس کی ایک وجہ ٹھہرایا گیا بلکہ حالیہ ۲۰۱۰ء میں سیلاب کی تباہ کاریوں سے پورے کے پورے شہر، بے شمار گاؤں اور متعدد آبادیاں مٹی میں مل گئیں،زمینی رابطے منقطع ہوگئے اور فصلیں ملیامیٹ ہوگئیں ۔جس وسیع پیمانے پر تباہی و بربادی کے مناظر دیکھنے میں آئے (خصوصاً صوبہ خیبر پختون خواہ،صوبہ پنجاب اور صوبہ سندھ میں) اس سے دل امکانیت سے زیادہ یقینیت کی طرف مائل ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا اور اسی طرح سیلاب کی تباہ کاریوں کے شواہد موہنجو داڑو سے بھی عیاں ہیں۔ بقول سپنگلر :

> موہنجوداڑو میں کھدائی شدہ سطحوں میں کم از کم تین بڑے سیلابوں کا ثبوت ملا ہے کہ جس سے شہر مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ ہو سکتا ہے کہ ایسی ہی تباہی نچلے حصے میں بھی آئی ہو۔ان سیلابوں نے جو مٹی بچھائی ہے اس کے تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مٹی ٹھہرے ہوئے پانی کی ہے ، بہتے دریا کی نہیں۔ جس کا مطلب ہے دریا کے نچلے حصے کی زمین ارضیاتی تبدیلیوں سے اوپر اٹھی ، دریا نے واپس حملہ کیا اور یہ شہر غرق ہو گیا۔ یہ شہر بتدریج زوال پذیر رہا۔ یہ شہر بار بار سیلاب سے تباہ ہوا اور ہر بار جب نئی تعمیرات ہوئیں تو ان کا معیار پہلے سے بہت پست تھا۔ بڑے مکانوں کے ملبے پر چھوٹے اور گندے مکان بنے۔ بڑے اناج گھر کے اوپر چھوٹے چھوٹے گھٹیا مکان بنے اور بتدریج دارالحکومت ایک وسیع و عریض کچی آبادی میں تبدیل ہو گیا۔[۲۴]

تحقیق کے نتیجے میں ماہرین نے اب تک مختلف طبعی ،جغرافیائی اور ماحولیاتی عناصر سے لے کر ممکنہ حملہ آوروں تک کو وادیٔ سندھ کے زوال کی وجہ ٹھہرایا مگر ان امکانی وجوہات میں کہاں تک صداقت ہے اس کا تسلی بخش جواب مزید تحقیقات کی صورت میں ہی مل سکتا ہے۔

وادیِ سندھ کے حوالے سے یہ قدیم اور مقبول نظریہ ہے کہ اس تہذیب کو آریاؤ ں نے تباہ کیا اب صرف اس حد تک تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس تہذیب کی تباہی میں ایک عنصر آریہ قبائل کے حملے بھی ہیں ۔ موہنجوداڑو اور ہڑپہ کے برآمد ہونے کے بعد سے یہ خیال کہ ہندوستان میں آریاؤ ں نے تہذیب کی بنیادیں ڈالی تھیں غلط ثابت ہو چکا ہے آریاؤں سے پیشتر بھی ہندوستان کا وہ علاقہ جو اب مغربی پاکستان بن گیا ہے اس تہذیب کا گہوارہ رہ چکا ہے جو اس برِّعظیم میں سب سے قدیم اور بہت حد تک مکمل تھی۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ وادیِ سندھ کی تہذیب ایک منظّم ،مربوط اور مرتکز ریاست اور سلطنت کی پیداوار تھی اس بات کا ثبوت شہروں کی عمدہ بناوٹ ،آرام د ہ مکانات ،پانی کے مہیا کرنے اور استعمال شدہ پانی کو نکالنے کے طریقے ،پبلک عمارتیں اور حمام،کشادہ سڑکیں اور تنگ گلیاں اور ایسے بازار ہیں جہاں ضروریاتِ زندگی سے متعلق تمام اشیاء بہ آسانی دستیاب ہو سکتی تھیں۔علاوہ ازیں اس وسیع و عریض خطے میں یکساں اوزان، پیمانے ،مہریں،ظروف،آلات و اوزار، رسم الخط اور فنِ تعمیر بھی اس بات کی دلالت کرتے ہیں کہ بغیر ایک منظّم ریاست اور مرکزی حکومت کے اتنی سختی سے ان چیزوں کا نفاذ دور دور تک کے علاقوں میں نا

ممکن ہے ۔ یہ ہرگز رضا کارانہ ،خود رو یا اتفاقیہ نہیں۔سخت گیر قانون کی بدولت ہی یہ یکسانیت اور مساوات جنم لے سکتی ہے ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قومیں اپنے ماضی سے سبق سے سیکھ کر حال اور مستقبل کو بہتر بنانے میں ہمہ وقت کوشاں رہتی ہیں اور وہ قومیں جو قدیم ماضی یعنی قبل مسیح سے تعلق رکھتی ہیں وہ اگر اس وقت اتنی مہذب ،ترقی یافتہ تھیں تو اتنا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود ہم اسی حساب سے ترقی کی بجائے تنزلی کے سفر پر گامزن ہیں کیوں؟ جب کہ ایک نسل جس سنگِ میل پر اپنی ترقی کے سفر کا اختتام کرتی ہے دوسری نسل اس سے آگے یعنی اس عمارت کے اوپر اپنی عمارت تعمیر کرتی چلی جاتی ہے لیکن تاریخ و تہذیب کے اس سفر میں کچھ ایسا دکھائی نہیں دے رہا۔ کیوں ؟

پرانی تہذیبوں کے متعلق بہت حد تک تحقیق ،کھوج اور پتہ چلائے جانے کے باوجود ابھی تک کوئی حتمی اور دوٹوک رائے سامنے نہیں آسکی ان پرانی تہذیبوں کی تباہی و بربادی اور ملیا میٹ ہونے کا اصل سبب اور وجہ کیا تھی ؟ آیا یہ تباہی آتش زدگی کی بدولت یا بغاوتوں کے ذریعے حملے اور قتلِ عام ہونے سے یا بڑے پیمانے پر سیلاب اور طوفانوں کے سبب یہ تباہی عمل میں آئی یا کوئی ایسی خطرناک قسم کی وبا پھیلی جو عذابِ الٰہی کی صورت میں ان سب کو نیست و نابود کرتی چلی گئی جو کچھ بھی تھا ایسا ہی ہونا تھا کیوں کہ ہر عروج کو زوال ہونا لازمی امر ہے انسانی کلچر میں تنوع ،مختلف جغرافیائی حالات ،عقائدوافکار اور زندگی کے گوناگوں تجربات کی بدولت ہی ہوا کرتا ہے اور وہی کلچر زندہ کہلاتا ہے ،جس میں نئے تغیرات قبول کرنے کی فراخ دلانہ حِس موجود ہو اس اعتبار سے برِعظیم پاک و ہند کی سرزمین بہت زرخیز رہی ہے جس نے اپنی کوکھ سے بے شمار تہذیبوں اور ثقافتوں کو جنم دیا۔

مسئلہ صرف یہ ہے کہ ہم تمدنِ ہند کے آغاز سے لے کر درجہ بہ درجہ ارتقا کی چند درمیانی کڑیاں ابھی تک دریافت نہیں کر پائے یعنی وادیٔ سندھ کے زوال (۲۵۰۰ء ق م) سے لے کر ہندوستان میں آریاؤں کی آمد (۲۰۰۰ء ق م) تک کے درمیانی پانچ سو سالوں کے متعلق ابھی تک کوئی علم نہیں ہے کہ اس زمانہ میں یہاں کوئی تہذیب تھی بھی یا نہیں ۔ برِعظیم پاک و ہند میں ایک رائے کے مطابق آریائی نسلیں جنوبی ایشیا کے سردترین پہاڑوں سے نکل کر اس زرخیز خطے میں وارد ہوئی تھیں۔تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ قدیم انسان کی ایسی تمام ہجرتوں کا مقصد اپنی بقا کے لیے معاش کے نئے راستے ،زرخیز میدانوں اور

چراگاہوں کا حصول تھا۔ جہاں پانی اور شادابی نظر آئی وہیں ٹھکانہ کر لیا اسی لئے کہا جاتا ہے کہ مشرق کی بڑی تہذیبیں دریاؤں کے کنارے جنم لے کر تاریخ کو اپنے عروج، پھیلاؤ اور زوال کی داستانیں دے گئیں۔ بقول یحییٰ امجد:

> برِصغیر پاک وہند میں قدیم ترین غیر مُلکی نسلیں باالترتیب نیگرو، کاکیشیائی (پروٹو آسٹریلائڈ) منگول اور رومی النسل تھیں جو قدیم حجری دور کے مقامی انسانوں میں آکر یوں جذب ہوئیں کہ وادیِ سندھ کی تہذیب کے زمانے تک مخلوط نسلیں وجود میں آچکی تھیں یہ بھی قیاس ہے کہ وسطی حجری دور میں شمال مغرب کی بنیادی نسل کے یو ریشیائی لوگ، نیگرو یوریشیائی، آسٹریلیائی گروہوں کے (پاکستانی) علاقوں میں داخل ہوئے تو دونوں کے اختلاط و تفاعل سے وسطی حجری عہد کے آخر میں دراوڑ نسل نے جنم لیا۔۲۵

آریاؤں سے قبل ہندوستان کے قدیم باشندے جنہیں دراوڑی (Dravidians) کہا گیا ہے ۔پنجاب اور شمالی ہندوستان میں آباد تھے یہ سیاہ رنگ اور چھوٹے قد کے لوگ تھے۔آریاؤں کی آمد کے وقت اُنہیں آریاؤں سے جنگیں لڑنی پڑی تھیں اور ہندوؤں کی مذہبی روایات کی بنا پر جنگیں صدیوں تک جاری رہیں اور کافی خون ریزی کے بعد آریائی لوگ پنجاب کے علاقے پر قابض ہو سکے۔ان جنگوں کا حال ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتاب رگ وید کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ رگ وید میں بے شمار گیت اور بھجن موجود ہیں جو دیوتاؤں اور دیویوں کی شان اور تعریف میں لکھے گئے ہیں جن سے آریاؤں کی فتوحات ،طرزِ زندگی اور مذہبی عقائد کا پتہ چلتا ہے جس میں ان قدیم باشندوں کو جنگلی اور بربری بھی کہا گیا ہے لیکن حقیت میں یہ دراوڑی لوگ نہ جنگلی تھے اور نہ ہی بربری بلکہ انہوں نے منظم زندگی کی ابتدا کر لی تھی ۔پنجاب میں اپنی ریاستیں قائم کر لی تھیں اور گڑھ (قلعے) بنا لیے تھے اور ان کے تجارتی تعلقات بابل کے لوگوں سے قائم ہو چکے تھے لیکن یہ فنون جنگ میں آریاؤں سے زیادہ ماہر نہیں تھے اور نہ یہ دھات کے ہتھیاروں کے استعمال سے واقف تھے اس لیے انہیں آریاؤں کے مقابلہ میں شکست ہوئی تھی ۔ جب آریاؤں نے برعظیم میں مستقبل سکونت اختیار کی تو انہوں نے بہت سے مقامی عقائد و رسوم اور اسالیبِ حیات کو قبول کیا ۔مختلف قبیلوں نے مختلف رقبوں کو تصرف میں لے کر مقامی باشندوں سے امورِ نظم ونسق سیکھے اور الگ ریاستیں قائم

کیں۔ بقول سبطِ حسن:

> رفتہ رفتہ دریائے گنگا اور جمنا کی وادی پر آریاؤں کا مکمل قبضہ ہو گیا اور آریاؤں کی کثیر تعداد شمالی ہند میں آباد ہو گئی اس زمانہ کی تاریخ کا ماخذ ہندوؤں کی وہ قدیم رزمیہ نظمیں ہیں جو ''رامائن'' اور ''مہابھارت'' کے نام سے مشہور ہیں۔ ''رامائن'' میں اجودھیا کے راجہ دسرتھ کے بیٹے رام کے چودہ برس کے بن باس کے قصہ کو بیان کیا گیا ہے اور ''مہابھارت'' میں ہستناپور (دہلی کے قریب) کی ریاست کے حکمران کوروں اور پانڈوں کی جنگ اور اس کے نتائج کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہندو تو ان دو نظموں کے قصوں کو حرف بحرف تاریخی اعتبار سے صحیح مانتے ہیں لیکن حقیقت میں ان کی تاریخی حیثیت کچھ زیادہ مستند نہیں لیکن ان نظموں سے اس زمانہ کے حالاتِ زندگی اور معاشرت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔۲۶

رگ وید کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آریہ لوگ قبائل میں منقسم تھے ان کی اکثریت تو خانہ بدوش تھی لیکن وہ زراعت پیشہ تھے اس لیے ان کا خاصہ بڑا حصہ وادیٔ سندھ میں دیہی آبادیاں بنا کر آباد ہو گیا تھا۔ ہندوستان میں بتدریج رچتے بستے ہوئے آریا قبائل زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے ذات پات کی بندشوں میں بری طرح گھر گئے اور پیشوں کے اعتبار سے سوسائٹی کے مختلف طبقوں کی تقسیم زیادہ اہم ہو گئی تھی بادشاہ اور فوجی طبقہ کے علاوہ ''برہمنوں'' کا شمار بھی اعلیٰ طبقہ میں ہونے لگا تھا اور ان کی اہمیت بڑھنے لگی تھی اس اعلیٰ طبقہ کے بعد متوسط طبقہ کو ''ویش'' کا نام دیا گیا تھا جس میں تاجر، کاشتکار اور کاری گر شامل تھے۔ غیر آریائی نچلے یعنی ''شودر'' طبقہ سے تعلق رکھتے تھے ان کی حیثیت غلاموں کی سی تھی اور ان سے ہر وہ کام لیا جاتا تھا جو اعلیٰ اور متوسط طبقوں کے کرنے کا نہیں تھا۔ اس بارے میں ڈاکٹر محمد عمر کی رائے ہے:

> اس طرح رفتہ رفتہ پورا معاشرہ چار طبقوں میں تقسیم ہو گیا اور اہمیت کے لحاظ سے ۱۔برہمن ۲۔کھشتری ۳۔ ویش ۴۔شودر طبقوں میں آریائی ہندوستان کی پوری آبادی منقسم ہو گئی اور چندر گپت کے زمانہ تک مذہب پر برہمنوں کے اثرات قائم رہے اور ان کی عزت کی جاتی رہی۔ چندر گپت نے ہندوستان پر چوبیس سال حکومت

> قائم کی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا بندر سارا موریہ پچیس سال تک باپ کے نقشِ قدم پر چلتا رہا اس کے بعد اس کا بیٹا اشوکِ اعظم جس نے بدھ مذہب کو پورے ہندوستان میں نافذ کروایا۔ اشوک کے بعد موریہ سلطنت پر زوال آگیا اور کچھ ہی عرصہ بعد موریہ سلطنت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہوگئی اور ہندوستان پھر ایک مرتبہ خانہ جنگی کے دور میں داخل ہوگیا۔۲۷

برعظیم میں جس طرح مختلف ادوار میں مختلف حکمران آتے رہے بعینہٖ مختلف تہذیبیں اور ثقافتیں بھی ان علاقوں کا حصہ رہی ہیں۔ برعظیم ہمیشہ سے کسی ایک تہذیب کی بجائے مختلف تہذیبوں کی آماج گاہ رہا ہے جب کہ یہ تہذیبیں اسی خطے میں پنپتی اور ارتقائی سفر کرتی رہیں۔ ہر تہذیب دوسری تہذیب پر نہ صرف اثرانداز ہوتی رہی ہے بلکہ متاثر ہونے کا عمل بھی برابر جاری رہا ہے برعظیم میں یہ تہذیبی تسلسل قرنوں سے جاری ہے اس لیے برعظیم کی سرزمین مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کا ایسا مجموعہ رہا ہے جس میں ہر تہذیب اپنی روایات و اقدار کے ساتھ نظر آتی ہے فطری تغیرات اور تبدیلیوں کی بدولت تہذیبوں کی اشکال بنتی اور بگڑتی رہی ہیں اور ان کے اندر شکست و ریخت کا عمل بھی ہمیشہ سے جاری رہا ہے۔تہذیبی ٹوٹ پھوٹ اور تبدیلیوں کے باوجود ہر تہذیب نے اپنی زندگی اور بقا کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہے اسی وجہ سے بعض تہذیبوں کے خدوخال اور نقوش مٹنے کے بعد بھی ان کا وجود کسی نہ کسی شکل میں برقرار رہا ہے۔ برعظیم میں مختلف تہذیبوں کے ملاپ سے ایک اجتماعی اور ملی جلی تہذیب کے نقوش بھی ملتے ہیں یہی وجہ ہے کہ برعظیم کی تہذیب ایک ہی وقت میں ہندو تہذیب، مسلم تہذیب، مغربی تہذیب، بدھ مت زرتشت، جین مت، انگریزی اینگلوانڈین اور کئی دیگر تہذیبوں کے میلانات ورجحانات کی عکاس ہے

برعظیم ہزاروں سالہ پرانی تہذیب و ثقافت کی تاریخ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اب ہم سب پہلے ہندی تہذیب کے متعلق آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ہندی تہذیب کی یہ خاصیت رہی ہے کہ اس نے تمام مہاجر تہذیبوں کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ برعظیم کی تہذیب نے مختلف ادوار میں نووارد تہذیبوں کو اس طرح اپنے اندر سمو لیا کہ وہ اپنی حقیقی شناخت کھو بیٹھیں بلکہ ان نووارد تہذیبوں کی آمیزش سے اس کا اپنا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا بیرونی تہذیبیں جو روایات و اقدار اور تہذیب و ثقافت لے کر آئیں ان روایات و اقدار، تہذیب و ثقافت اور نئے رجحانات و میلانات کو برعظیم کی تہذیب نے نہ صرف اپنایا بلکہ یہ

تہذیب تبدیلیوں اور تغیرات سے دو چار بھی ہوئی اور اس میں جدیدیت کے رجحانات بھی پیدا ہوئے۔

ہندی تہذیب میں برہمنوں کو اوّلیت حاصل رہی اور انہوں نے اپنے بنائے ہوئے ذات پات کے حوالے سے چھوٹے چھوٹے طبقوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا اور انہیں ان کے حقوق سے محروم رکھا۔ برہمنوں کی حکومت اور ان کے اثرات پورے برعظیم پر تھے۔ان کے بڑھتے ہوئے احساسِ برتری اور زعم نے محکوم طبقات کے اندر احساسِ محرومی کے جذبات کو جنم دیا جس سے برعظیم کی تہذیبی وثقافتی زندگی شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی۔ بقول قرۃ العین حیدر:

> سارے دیش میں برہمنوں اور کھشتریوں کا رواج تھا۔سندھ کی وادی میں برہمنوں کی حکومت تھی ۔شراوستی والے مگدھ کے باسیوں کو پہلے ہی کب خاطر میں لاتے تھے۔ برہمنوں کا احساسِ برتری آریوں کے اس دور کی یادگار تھا جب انہیں ڈینیوب کے ساحلوں پر قبائلی فوقیت حاصل تھی ۔۲۸

ہندی تہذیب کبھی جمود یا ٹھہراؤ کا شکار نہیں ہوئی حالاں کہ بعض حرکات اور عوامل اس کے خدو خال کو بناتے اور بگاڑتے رہے ہیں اور اس کی شکلیں بھی تبدیل ہوتی رہی ہیں ۔وہ تبدیلیاں کبھی کسی انقلاب کے زیرِ اثر اور کبھی کسی حادثے کے نتیجے میں وقوع پزیر ہوئیں ۔گویا ہندی تہذیب کا سفر ہمیشہ زمانے کے نشیب وفراز کے حوالے سے جاری رہا اور یہ نشیب وفراز ہی اس تہذیب کی پہچان اور اس کی انفرادیت کو واضح کرتے ہیں۔

آٹھویں صدی عیسوی میں برعظیم میں مسلم تہذیب کے حوالے سے تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں ۔مسلمان فاتحین اور تاجروں کی رفتہ رفتہ آمد کے بعد ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم نے دیبل سے ملتان تک کا علاقہ فتح کر لیا اس طرح علاقے میں اسلام کی آمد ہوئی ۔مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہاں ہندو راجہ کی حکومت تھی۔مسلمانوں کی آمد کے بعد اس خطۂ زمین پر ایک نئی ثقافت کا دور شروع ہوا۔بھمبھور اور منصورہ کے شہروں سے مسجد کے آثار کے علاوہ عرب دور کے کچھ سکے بھی ملے ہیں۔اس عہد میں فنِ تعمیر ،مصوری ،خطاطی اور موسیقی کے فن کو ترقی ملی۔اس خطِہ زمین پر مسلم تہذیب جس کی بنیاد محمد بن قاسم نے رکھی مختلف حکمران خاندانوں غزنوی ،غوری، خلجی، تغلق، سادات،سید،لودھی اور مغلوں سے ہوتی ہوئی ہمارے ثقافتی ورثے کی صورت میں ہم تک پہنچی اور آج ہم اسے اپنی ”ثقافتی تاریخ“ کہتے ہیں۔

اسلامی ثقافت کوئی ایسی متعین شے نہیں جو ہر ملک کے مسلمانوں میں ہر لحاظ سے یکساں ہو۔اسلام رنگ،نسل،وطن،زبان اور پیشے پر اپنی قومیت کی بنیاد نہیں رکھتا بلکہ اس کی اساس ایک تصور (Idealogy) پر ہے اسلام تمام اختلافات کے باوجود ان تمام لوگوں کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے جو اسلامی تصور کے دائرہ کار میں داخل ہو جائیں ۔غرض اسلامی ثقافت ،اختلاف واتحاد کی جامع ہے۔بنیادی اتحاد اور فروعی اختلاف دونوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔اسلامی ثقافت ہر وہ ثقافت ہے جو (دوسری ثقافتوں سے بعض باتوں میں متحد ہونے کے باوجود) دوسری قوم سے ممتاز کر دے ۔اسلامی ثقافت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ'' الف'' سے لے کر''ے'' تک ہر بات میں غیر مسلم کلچر سے جدا ہو کچھ چیزیں مشترک ہوں گی اور کچھ جُدا، ہر کلچر کی یہی صورت ہوگی ۔اس سلسلہ میں مولانا شاہ محمد جعفر ندوی لکھتے ہیں:

> ہر ثقافت کا خالق کوئی خاص تصور ہوتا ہے ۔اسلامی کلچر کے پسِ پردہ بھی ایک عقیدہ و تصور ہے اور وہ ہے خدا پرستی یا لَا اِلٰہَ اِلا اللہ پر ایمان ۔اس تصور کی جڑ سے جو شاخ بھی نکلے گی وہ عین اسلامی ثقافت کی حامل ہو گی خواہ کسی دوسری ثقافت کی شاخ سے ہم شکل ہی کیوں نہ ہو ۔۲۹

برِعظیم میں مسلمانوں کی زندگی نہ صرف مسلسل تبدیلیوں سے دو چار ہوتی رہی ہے بلکہ اسلامی تہذیب کے اثرات بھی دیگر مذاہب اور ان کے ماننے والوں نے بہت حد تک قبول کئے جس سے ایثار ،قربانی اور رواداری کے جذبات اور احساسات کو تقویت حاصل ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ برعظیم میں رہنے والے لوگوں کے فکر وخیال اور فہم وفراست میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔ جہالت اور تاریکی کم ہوتی چلی گئی ۔مسلم تہذیب کے احیا سے صدیوں سے رائج برعظیم میں حاکمیت کا تصور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا ۔ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے نہ صرف وہاں کے سیٹ اپ میں تبدیلی رونما ہوئی بلکہ برعظیم کے نظامِ حکومت میں انتظامی وحدت کی صورت بھی نظر آنے لگی تھی جس سے معاشرہ ترقی اور خوشحالی کی جانب چلنے لگا ۔ بقول شیر محمد گریوال:''مسلمانوں نے سرزمینِ ہند کو انتظامی وحدت بخشی اور اسے استحکام اور ترقی سے ہم کنار کیا''۔۳۰

برعظیم میں جیسے جیسے مسلم تہذیب کا ارتقا ہوتا چلا گیا یہ اپنی نمایاں خصوصیات سے دیگر تہذیبوں سے منفرد اور ممتاز ہوتی چلی گئی اور لوگوں پر اس کی بنیادی خصوصیات اور اصول وضوابط بھی عیاں ہوتے چلے

گئے اس طرح اس تہذیب میں دیگر مختلف مذاہب سے وابستہ لوگوں کی ایک کثیر تعداد شامل ہوتی چلی گئی ۔ان لوگوں نے اپنے اپنے مذاہب سے دوری اختیار کر کے اسلام کی ابدی اقدار کو اپنانے میں عافیت سمجھی ۔مسلم تہذیب کے احیا سے برہمنوں کی اجارہ داری بُری طرح مجروح ہوئی اور مساوات کا نظام رائج ہوگیا۔لوگوں کو برابری کی سطح پر سوچنے اور زندہ رہنے کا حق حاصل ہوا اور ہر طرح کے نسلی اور معاشرتی امتیازات مٹتے ہوئے دکھائی دیئے۔برعظیم کی تہذیب پر ہندومت کے اثرات صدیوں سے غالب تھے اور معاشرتی سطح پر سماج کئی طبقات میں بٹاہوا تھا لیکن مسلم تہذیب کی آمد سے یہ طبقاتی تقسیم کافی حد تک مٹ گئی ۔برہمن معاشی معاشرتی ، اور سیاسی اور مذہبی حوالے سے زندگی کے ہر معاملے میں دوسرے طبقوں پر حاوی تھا اور اس کا کہنا حکم کے زمرے میں آتا تھا جب کہ ہندوٗ معاشرے میں شودر کو حقیر،گھٹیا،اور ذلیل سمجھا جاتا تھا اس کی زندگی محض دوسروں کی خدمت کے گرد گھومتی تھی ۔دوسری ذاتوں کی خدمت کے علاوہ اس کی کوئی اپنی پہچان اور تشخص نہ تھا حتیٰ کہ وہ دیگر مذاہب کی مذہبی کتب نہ تو پڑھ سکتا تھا نہ ہی سن سکتا تھا۔محمد مجیب کے مطابق:''شودر کا دھرم یہ تھا کہ تینوں اونچی ذات کے لوگوں کی ہر طرح سے خدمت کرے۔ وہ دینی کتابوں کو پڑھ سکتے تھے اور نہ ہی سن سکتے تھے۔''۳۱

جیسے جیسے اس اکثریتی طبقے کا استحصال جاری رہا ان کے ذہنوں میں نفرت کا احساس پروان چڑھتا گیا۔اس کی نفرت کی بدولت ہندوستان کی تہذیب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی چلی گئی ۔ برعظیم میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد زندگی کے تمام شعبوں میں مساوات ،بھائی چارہ انصاف اور رواداری جیسی صفات قائم ہوئیں یہی وجہ ہے کہ ہندووٗں کا یہ پسا ہوا اور اکثریتی طبقہ مسلم تہذیب کی طرف مائل ہونے لگا اور اس کا سہرا مسلمان صوفیا کو جاتا ہے ۔ہر دور میں دو طبقات ہمیشہ سے رہے ہیں جس میں ایک طبقہ بادشاہوں کا ہے جن کا تعلق خواص کے ساتھ رہا ہے اور دوسرا طبقہ صوفیا کا ہے جن کا تعلق عوام کے ساتھ رہا ہے اور ان کے مفادات عوام کے ساتھ وابسطہ تھے وہ عوامی ثقافت کے محافظ تھے ،طبقاتی نظام اور اونچ نیچ کے مخالف تھے،سادگی پسند تھے،مساوات کے قائل تھے، انسان دوستی کا درس دیتے تھے، حاکم ومحکوم کی تقسیم ختم کرنا چاہتے تھے سب کے لئے یکساں انصاف کے طالب تھے نتیجہ یہ ہوا کہ دن بہ دن وہ حکمران طبقوں سے کٹ کر عوام کے ساتھ گھل مل گئے اس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل احمد جالبی بتاتے ہیں :

ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کرنے والوں میں صوفی اپنی مرتاضانہ تربیت کے

> باعث عالم اور فقیہہ کے مقابلے میں عوام الناس کے زیادہ قریب تھا کیوں کہ مؤخرالذکر بالعموم تعصب اور کردار سے عاری ہوتا تھا اور اس میں گہرے روحانی احساس کا بھی فقدان ہوتا تھا۔صوفی ہر شہر قصبہ اور گاؤں میں اپنے اردگرد اپنے مریدوں کا ایک حلقہ قائم کر لیتا تھا اور اس کے بیرونی حلقۂ ادارت میں غیر مسلم اور خاص طور پر اچھوت ذات کے ہندو شامل ہوتے تھے۔۳۲

ان صوفیا کا عوام پر بہت اثر تھا اور بادشاہوں نے اس میں مصلحت سمجھی کہ ان کی تعظیم کی جائے ۔بعض جگہوں پر، مثال کے طور پر مغربی پنجاب اور سندھ میں روحانی رہنما اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے عوام کی شکائتیں رفع کراتے تھے۔لیکن عام طور پر صوفیائے کرام دنیاوی معاملات سے دور رہتے تھے۔اس سلسلے میں شیخ محمد اکرام رقم طراز ہیں:

> اہم صوفی اولیا اور ہزاروں دوسرے اشخاص برصغیر میں شہروں، قصبوں، اور گاؤں میں مصروفِ عمل تھے ان کی کوششوں سے آبادی کے ایک بڑے حصے نے اسلام قبول کیا ۔حقیقت یہ ہے کہ ان مبلغوں کا اثر مسلمان بادشاہوں کے سیاسی اثر سے کہیں زیادہ دیر پا ثابت ہوا۔اس کے علاوہ ان کی وجہ سے ہندو مذہب میں بھی دوررس تبدیلیاں آئیں۔ہندوؤں میں ایسے فرقے پیدا ہوگئے جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہندومت اور اسلام دونوں ہی صحیح راستہ دکھاتے ہیں۔۳۳

مسلمان صوفیا نے ایسے مراکز قائم کئے جہاں سے اسلام برعظیم کے مختلف علاقوں میں پھیلا۔ان کی اپنی مجالس اور خانقاہیں تھیں جو درس وتدریس کے ساتھ شریعت وطریقت کے روحانی منازل طے کرانے کی تربیت گاہیں تھیں۔ دراصل یہی وہ بزرگ تھے جنہوں نے عملی طور پر برعظیم پاک و ہند کے گوشے گوشے میں تبلیغِ دین کا فریضہ انجام دیا اور ایسے مقامات پر جہاں شاہی لشکر اور حکومتوں کے قدم بھی نہیں پہنچے تھے وہاں یہ پیغام پہنچایا۔سلاطین اور امرا کی حکومتیں تو ریاستوں اور علاقوں پر تھیں اور انقلابِ زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی تھیں لیکن صوفیا کی حکومت لوگوں کے دلوں پر تھی اور زمانے کی کوئی گردش ان کی حکومت پر اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔صوفیا نے اپنے روحانی دربار لگائے جن کا مقابلہ سلطانی درباروں سے تھا۔مخلوق دنیا دار حکمرانوں کے حرص وتکبر سے پریشان ہوتی تو روحانی درباروں میں حاضر ہو کر زندگی کی اچھائی کا احساس

TH9309C

بحال کرتی۔اس بارے میں خاور جمیل کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

> حرم، مسجد اور خانقاہ اسلامی روحانیت میں پیش پیش ہیں۔ میکدہ تو بس عجمی شاعروں کے عالمِ خیال میں آباد رہا اور یوں منبر سے واعظ نے گناہ گاروں کو ڈرایا تو مسندِ سخن سے غزل گو نے معاملاتِ محبت کا ترنم چھیڑا اور خدا کو ساقی کہہ کر اس سے جامِ سرور طلب کیا۔۳۴

مسلم تہذیب کے ہمہ گیر پہلوؤں نے برعظیم کے ہر حلقے کو متاثر کیا۔ اسلام کے عدم تعصب، عدل اور رواداری جیسے زریں اصولوں نے تمام طبقوں کے باشندوں کو جینے کا حق دیا اور کسی سے بھی امتیازی سلوک روا نہ رکھا اور نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی تہذیب پھلتی پھولتی چلی گئی پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک ایسا وقت آیا کہ برعظیم میں مسلم تہذیب کے اندر بھی اندرونی اور بیرونی یورشوں کی بدولت شکست و ریخت کا عمل جاری ہوا اور اس طرح ہندوستان میں امن اور شانتی غارت ہوتی چلی گئی۔ مسلم تہذیب کی بہت سی اقدارو روایات کو پامال کیا گیا اور اس کے نقوش بری طرح مسخ کئے گئے جہاں مسلم تہذیب نے ہندو تہذیب پر اثرات چھوڑے وہاں ہندو تہذیب نے بھی مسلم تہذیب کو متاثر کیا تو اس طرح ایک مشترکہ تہذیب کے خدوخال نمایاں ہوتے چلے گئے۔ یہ ہندو مسلم تہذیب جو مختلف خصوصیات کا مرقع بن گئی، زندگی کے ہر شعبے پر غالب آتی گئی اس بارے میں صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں: ''مسلم تہذیب نے جہاں ہندو مت تہذیب پر اثرات چھوڑے وہاں خود مسلم تہذیب نے کسی حد تک ہندو مت تہذیب کے اثرات کو قبول کیا''۔ ۳۵

ہندی، مسلم تہذیب کے باہمی ملاپ سے ایک مشترکہ ہندی، مسلم تہذیب کا آمیزہ تیار ہوا۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی بہت سی روایات، اقدار طرزِ زندگی اور رسوم و رواج کو اپنا لیا۔اس بارے میں ایک مثال ملاحظہ فرمائیے:

> اور دیپالی نے خود اپنے گاؤں میمن سنگھ میں دیکھا کہ برہمادتہ قیر جو مسلمان تھے منتر پڑھ کر اور گھنٹیاں بجا بجا کر مسلمان کسانوں کی مرادیں پوری کرنے کا تپ کرتے تھے اور مسلمان کسانوں کے ہاں شادی کے موقع پر منگل چنڈی وجے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔۳۶

ہندی تہذیب نے دیگر بہت سی مختلف تہذیبوں کو اپنے اندر سمویا اسی طرح مسلم تہذیب کے اثرات کو بھی پوری طرح اپنے اندر جذب کیا یہاں تک کہ ہندوؤں کی ایک بہت بڑی تعداد نے مسلم تہذیب کی روایات و اقدار کو اپنی زندگی کا ایک لازمی عنصر بنا لیا۔ جہاں مسلم تہذیب تھی وہاں ہندی تہذیب کے اثرات بھی گہرے تھے جو آج بھی کہیں کہیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہندی، مسلم تہذیب کے اشتراک سے جو فطری آمیزہ وجود میں آیا وہ نہ تو بالکل اسلامی تھا اور نہ ہی ہندی بلکہ دونوں تہذیبوں کی آمیزش سے مشترک چیزیں وجود میں آئیں اور یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔ شہزاد حسین کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

> مسلمان پردہ دار عورتیں جنھوں نے ساری عمر کسی ہندو سے بات نہ کی تھی رات کو جب ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو لہک لہک کر الاپتیں۔۔۔ پھر گگری موری ڈھرکائی شام۔۔۔ کرشن کنہیا کے اس تصور سے ان لوگوں کے اسلام پر حرف نہ آتا تھا۔۳۷

> ہندو اور مسلمانوں میں سماجی طور پر کوئی فرق نہ تھا خصوصاً دیہاتوں اور قصبہ جات میں عورتیں زیادہ تر ساریاں اور ڈھیلے ڈھالے پاجامے پہنتیں اودھ کے بہت پرانے خاندانوں کی بیگمات اب تک لہنگے پہنتی ہیں۔ بن بیاہی لڑکیاں دونوں ساری کے بجائے کھڑے پائچوں کا پائجامہ پہنتیں۔۳۸

تاہم برعظیم میں ہندی تہذیب نے اسلامی تہذیب پر گہرے اثرات مرتب کئے اور مسلمانوں نے ہندوؤں کی بہت سی ثقافتی اقدار اور رسوم و رواج کو اپنایا۔ اس طرح ہند اسلامی تہذیب کے نقوش ابھر کر سامنے آئے اور مسلمانوں کی تہذیب غالب ہونے کے باوجود مقامی تہذیب سے دامن نہ بچا سکی۔ اس وقت برعظیم میں ایک ایسی تہذیب موجود تھی جس کا اپنا ایک مخصوص کلچر اور روایات و اقدار تھیں۔ یہ روایات و اقدار پورے برعظیم کے لوگوں کے پہچان تھیں اور لاکھوں لوگ اس مخصوص تہذیب اور کلچر سے جڑے چلے آ رہے تھے۔ یہ مخصوص انداز سے اپنا تہذیبی ارتقا جاری رکھے ہوئے تھی اور اس میں لمحہ بہ لمحہ تبدیلیاں ہو رہی تھیں جو ایک مخصوص تہذیب کے پھیلاؤ اور ترقی کی غماز تھیں۔

جب ہندوستان میں مغل وارد ہوئے تو وہ اپنے ساتھ ترکوں اور ایرانیوں کو بھی لائے گویا برعظیم میں ترکوں اور ایرانیوں کی آمد سے ترک اور ایرانی تہذیب بھی داخل ہوگئی۔ بابر اگرچہ اسلامی تہذیب اپنے ساتھ لایا لیکن اس میں ترکی اور ایرانی ثقافت کی آمیزش بھی تھی۔ ترک اور ایرانی اپنے علاقوں کی ثقافتی،

تہذیبی اور تمدنی روایات واقدار بھی لے آئے جو اثرات ہندوستانی تہذیب پر بھی پڑے ۔جب کہ ہندوستانی تہذیب دیگر اور بہت سی تہذیبوں کا مجموعہ تھی جہان ہندو،مسلمانوں کے اثرات قبول کر رہے تھے وہاں وہ مسلم تہذیب پر اثرانداز بھی ہو رہے تھے گویا دونوں تہذیبیں ایک ہی وقت میں ایک دوسرے سے متاثر ہوئیں ۔اس طرح بہت سی نئی چیزوں نے اس تہذیب کی کوکھ سے جنم لیا۔طرزِ بودوباش یعنی زبان،رہن سہن اور لباس تک ہر چیز تبدیلی کے عمل سے دو چار ہوئی۔ان تبدیلیوں کو ہندو مسلم دونوں تہذیبوں نے قبول کیا ۔کافی حد تک دونوں تہذیبوں سے وابستہ افراد نے ایک دوسرے کے رجحانات ومیلانات اور طرزِفکر کو سمجھا اور اپنایا تو اس طرح ان دونوں کے درمیان محبت اور خلوص کے جذبات و احساسات بھی پھلنے پھولنے لگے ۔ہندوؤں نے مسلمانوں کے علوم وفنون اور حکمت سے استفادہ کیا بلکہ ان کو مکمل طور پر اپنالیا یہاں تک کہ یہ علوم وفنون ہندوتہذیب کا حصہ بن گئے ۔جن سے ہندو مذہب کی روح نے بھی گہرے اثرات قبول کئے۔ اس بارے میں ڈاکٹر تارا چند کی رائے ہے:''ہندو مذہب نے حکمت جیسے مسلم عناصر کو جذب کیا ، بلکہ خود ہندوتمدن کی روح اور ہندو ذہن بھی تبدیل ہو گیا''۔۳۹

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی صورت حال بالکل بدل کر رہ گئی۔ ایک نئی تہذیب ، جو مغربی میلانات ، روایات اور رجحانات لئے ہوئے تھی برِعظیم پر چھا گئی ۔مقامی مسلم تہذیب کی شدید شکست و ریخت کی بدولت ہی انگریزی تہذیب کو پنپنے کا موقع ملا۔ انگریز چوں کہ حاکم تھا اپنی تہذیب کوفروغ دینا اس کے لئے مشکل نہ تھا اور تھوڑے ہی دنوں بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ اپنی تہذیب وتمدن سے بیگانگی ظاہر کرتے ہوئے انگریزی تہذیب وتمدن کا دلدادہ بن گیا ۔یہ گروہ مادر پدر آزاد ہوٹلوں، ریسٹورانوں اور کلبوں کی رونقوں کو دوبالا کرنے لگا۔دن رات اور مشرقی اقداروروایات کی پرواہ کئے بغیر انگریزوں کا ہمنوا اور مغربی تہذیب کا دلدادہ نظر آنے لگا۔ اس آزاد خیال طبقے نے ہندومسلم کلچر کو خاصا متاثر کیا اسی خاص طبقے کی دیکھا دیکھی عام مسلمانوں اور ہندوؤں میں بھی آزاد روی کا عنصر پروان چڑھنے لگا ۔قدیم ہندومسلم تہذیب اور مغربی تہذیب کی آمیزش سے نئی ثقافت ابھری لیکن قدیم اور جدید قدروں کے ساتھ ساتھ مذہبی منافرت سے اس ثقافت کو نقصان پہنچا ۔ایڈورڈ مائیکل کہتے ہیں:

''انگریزوں کے احساسِ برتری اور پادریوں کی مذہبی منافرت سے نئی ثقافت کو نقصان پہنچا''۔۴۰

جب ہندمسلم اور انگریزی تہذیب کا باہم ٹکراؤ عمل میں آیا تو ہندوستان کی ثقافتی تہذیبی اقدار بری

طرح متاثر ہوئیں اور لوگوں کی زندگی میں مغربیت کے اثرات آہستہ آہستہ راسخ ہوتے چلے گئے ۔ یہ طبقہ گویا اپنی کوئی پہچان اور تشخص نہیں رکھتا تھا کیوں کہ وہ اخلاقی ، مذہبی اور معاشرتی اقدار کے احساس سے بھی عاری تھا ۔ علاوہ ازیں اپنی روایات و اقدار کی پامالی کے ساتھ ساتھ وہ انگریزوں اور ان کی تہذیبی اقدار کا ترجمان بن گیا ۔

انگریزوں ، مراعات یافتہ طبقوں اور مغربی تہذیب کے دلدادہ لوگوں نے مسلم تہذیب کے نقوش بگاڑنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ برعظیم میں مسلمانوں کے اندر وہ بنیادی سوچ جو مسلم علوم کے حوالے سے تھی اور قدیم عرصے سے تھی اس پر کاری ضرب لگی ۔ اسلامی علوم کی جگہ مغربی علوم نے لے لی جو باہمی تضادات اور اختلافات کا باعث بنی ۔ اس سے مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان خلیج بڑھتی گئی عربی فارسی اور دوسری بہت سی زبانیں جو مسلم تہذیب و ثقافت کی عکاس اور مسلم تہذیب کی روایات و اقدار کو نمایاں کرنے میں مددگار تھیں ان کو مدارس سے ختم کر کے انگریزی زبان کو لاگو کیا گیا ۔ انگریزوں کی مسلم کش سوچ اور ان کے تعصب نے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا ۔ مسلمانوں سے کہیں بڑھ کر ہندوؤں کے ایک بڑے طبقے نے مغرب کی اندھی تقلید میں انگریزی تہذیب و تمدن کو اختیار کیا ۔ حکومتی مراعات ملنے پر یہ طبقہ ہر معاملے میں انگریزوں کا معاون اور ہمنوا بن گیا ۔ اس مخصوص طبقے کی بدولت انگریزوں کے ہاتھ مضبوط ہوئے اور مسلمان تباہی و بربادی کے علاوہ شدید نقصان سے دوچار ہوئے ۔ اس مخصوص طبقے کے متعلق قرۃ العین حیدر کی رائے ہے:

> ہندوستان کے اوپری طبقے کی یہ وہ نسل تھی جو انگریزی کورسوں اور مورس ناچوں کے زیراثر پروان چڑھی ۔ عجیب ترحم انگیز اور مضحکہ خیز دورا ہے پر یہ لوگ زندہ تھے اپنے آپ کو ہندوستان کی پرانی فیوڈل تہذیب کا یہ وارث بھی گردانتے تھے اور ہر وقت اپنی تعریف میں مصروف رہتے تھے ۔[۴۱]

بعض لوگوں کا خیال تھا کہ مغربی تہذیب کے میلانات ورجحانات اور اقدار وروایات کو اپنانے سے انگریز مہربان ہو جائے گا اور انہیں مراعات اور سہولتوں سے نواز دے گا لیکن ان کا یہ خیال ، خیالِ محض نکلا اور یہ گمان سراسر غلط فہمی ، کم عقلی اور کوتاہ بینی پر مشتمل تھا انگریزوں نے اس مغرب زدہ طبقے پر کوئی توجہ نہ کی بلکہ اس نام نہاد اور مغربیت زدہ طبقے کو تضحیک اور تحقیر کا نشانہ بنایا۔

انگریز حکمرانوں نے ہندوستان میں مقامی عوام کے لیے فارسی کی بجائے پہلے اردو پھر ہندی اور پھر انگریزی زبان کو رائج کیا۔ مدرسوں کی جگہ سکول ،کالج اور یونیورسٹیاں قائم کر دیں ۔قواعدو منطق اور فلسفہ و الٰہیات کی جگہ سائنس لازمی قرار دے دی ،بادشاہت کی بجائے جمہوریت ریلوے کا موثر نظام ،آب پاشی کے لیے نہریں،سڑکیں حکمرانی کے لیے قانون و آئین اورفوج کے لیے نئے منظّم قوائد وضوابط اور اصول دے دیے۔ نئے جاگیرداروں اور رہے سہے امرا نے انگریز سرکار کی قربت اور پیروی میں فخر محسوس کیا اور ان کے بچے علی گڑھ سے لے کر آکسفورڈ کیمبرج اور میونخ تک علم کے حصول کے لیے جانے لگے۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے سماجی میل جول اور جنگِ عظیم کی پیدا کردہ کساد بازاری نے ایک نئے اینگلو انڈین طبقے کو جنم دیا جس کا مذہب کے ساتھ دور کا تعلق بھی نہ تھا اس طبقے میں ہندو مسلم دونوں طبقات شامل تھے۔اس لیے اس طبقے نے معاشرتی ،ثقافتی،اور تہذیبی سطح پر ہندوستان کی تہذیب و ثقافت پر اتنے گہرے اثرات چھوڑے کہ ان سے سرِموانحراف ممکن نہیں۔

اینگلو انڈین طبقے کی بڑھتی ہوئی جدت اور مغربیت نے ہندوستان کے مقامی لوگوں کی سوچوں کے زاویے تک تبدیل کر دیئے۔ اس طبقے کی روشن خیالی جو مادر پدر آزادی تک پہنچ چکی تھی ،نے لوگوں کے ذہنوں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس طبقے کی زندگی مغربی روایات و اقدار سے جڑی ہوئی تھی اور اس طبقے کا ہندوستان کی تہذیب و ثقافت سے تعلق نہ ہونے کے برابر تھا بلکہ بات یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ ہندوستان کے مقامی باشندوں میں سے کئی ایک معاشی حالت کو زیادہ مستحکم بنانے کے لیے اپنے مذاہب چھوڑکر عیسائیت میں داخل ہو گئے ۔ عیسائیت قبول کرنے والے اس طبقے نے انگریزوں سے اپنے تعلقات استوار رکھنے کیلئے ان سے شادیاں کیں یہ طبقہ اینگلوانڈین کہلایا ۔جس کی کوئی شناخت اور کوئی تشخص نہ تھا۔اس طبقے میں ہندو ،مسلم ،سکھ اور دیگر مذاہب کے لوگ بھی شامل تھے ۔

اینگلو انڈین طبقے نے برِعظیم پاک و ہند کی اجتماعی تہذیب کا نقشہ بدل کے رکھ دیا۔ یہ طبقہ ’’کوا چلا ہنس کی چال اور اپنی بھی بھول گیا‘‘ کے مصداق نہ تو اس میں مشرقی تہذیب کا عکس جھلکتا تھا اور نہ ہی مغربی تہذیب اس کی پہچان بن سکی۔نائٹ کلبوں ،شراب وکباب اور ہوٹلوں میں رات دن گزارنے والا یہ طبقہ ہندوستانی لوگوں کی اکثریت کے لیے نا قابلِ قبول تھا ۔ یہ طبقہ اگر چہ ہندوستان کی تہذیب کا ہی پروردہ تھا لیکن اس کی روایات مشرق سے بالکل مختلف تھیں۔ انگریزی تہذیب کی اندھا دھند تقلید نے ان کو کہیں کا نہ

چھوڑا۔ اس طبقے نے تو مشرقی روایات و اقدار کو روند کر رکھ دیا۔ اس بارے میں شمیم احمد کا کہنا ہے:

> اگر ہم گہری نظر سے دیکھیں تو یہ طبقہ جہاں مغربی اقدار کے تحت اس کے فکری غلبے کا ثبوت مُہیا کرتا ہے تو وہاں اس بات کی نشان دہی بھی کرتا ہے کہ آنے والا زمانہ مغربی تہذیب کی توسیع کا زمانہ ہو گا۔ ان میں اکثر کا المیہ یہ ہے کہ وہ مغرب کے بے روح اور بے جہت معاشرے میں کہیں کے نہیں رہتے۔۴۲

مقامی ہندوستانی تہذیبیں زوال کا شکار ہونے کے باوجود اپنی انفرادیت کے ساتھ بڑھتی چلی گئیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگریزی طرزِ زندگی، جدید معاشرتی تبدیلیوں اور لباس کو مقامی طبقوں نے اختیار کر لیا اسی لیے مسلمانوں کی اکثریت معتوب ٹھہری اور ان کی ذات کو ہمیشہ مشکوک سمجھا گیا۔

برعظیم میں اگر چہ انگریزی تہذیب سے تصادم سے مقامی تہذیبیں ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے دوچار ہوئیں لیکن کسی نہ کسی صورت میں ان تہذیبوں کا وجود برقرار رہا۔ انگریز کا لایا ہوا تہذیبی ڈھانچہ کسی بھی لحاظ سے مستقبل بنیادوں پر استوار نہیں تھا بلکہ عارضی اور ناپائیدار تھا۔ اس کے باوجود اس مغربیت کے اثرات دیر پا ثابت ہوئے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ انگریزی کلچر کی لائی ہوئی بہت سی روایات اور اقدار آج بھی برعظیم کے لوگوں کی زندگی کا حصہ چلی آ رہی ہیں اور بعض لوگ ابھی تک بلا واسطہ اور بالواسطہ مغرب کی تہذیب اور روایات کے اثرات سے باہر نہیں نکل سکے۔

ج: ادب اور تاریخ و تہذیب کے تصور کا باہمی رشتہ

وقت کے ساتھ ساتھ انسانی تاریخ مسلسل ارتقا پذیر رہی ہے۔ انسانی ترقی کے ارتقا کا یہ سفر ہمیشہ آگے کی جانب بڑھتا ہی رہا ہے۔ اس سفر کے اہم مدارج در اصل وسیع ہوتی ہوئی انسانی فکر کے مدارج ہیں۔ پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں اسی انسانی فکر و شعور اور علم و آگہی کی بدولت یورپ میں ایک عظیم انقلاب آیا، اس سے پہلے یورپ کے قدیم علوم بھی ایشیا کے علوم کی طرح جامد اور ساکت تھے کیوں کہ ایک طرف وہ قدیم علوم تھے تو دوسری طرف ان کی سرپرستی مذہبی رہنماؤں کے ہاتھ میں تھی پھر یورپ میں دینی اور دنیاوی علوم دو علیحدہ علیحدہ حصوں میں بٹ گئے اور اس طرح تجربے، مشاہدے اور تحقیق سے

ترقی کے نئے نئے دروا ہونے لگے ،جس سے معاشرتی علوم میں بھی کافی وسعتیں پیدا ہوئیں اور اس سے معاشرہ،سیاست اور حکومت بھی سائنس کے دائرے میں داخل ہو گئے اور کیمسٹری ، فزکس ،فلکیات اور ارضیات وغیرہ کی طرح معاشرتی سائنسوں میں بھی نئے نئے پہلو سامنے آئے ۔

سائنس کے اس ابھرتے ہوئے انقلاب اور نت نئی ترقیوں کی بدولت صنعتی سرمایہ داروں کو جاگیر دارانہ نظام کے خلاف آواز اٹھانے کی ضرورت محسوس ہوئی ،اس دور کا ادب ان حالات کی ترجمانی کرتے ہوئے سائنس کی روح سے ہم آہنگ دکھائی دیتا ہے لیکن اس کا رٹیزین نظامِ فلسفہ، جس میں محدود تصورات میں حقیقت کا ادراک محض عقل سے کیا جاتا تھا جو سترہویں صدی کا غالب فلسفہ معقولات تھا۔ تصورات و تخیلات پر مبنی ایسے فلسفے کی موجودگی میں سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں سائنس ترقی کی جانب مسلسل گامزن رہی چنانچہ اس معقولیت کے خلاف رومانوی تحریک کے ادب میں شدید احتجاج بھی کیا گیا جس میں تخیل کو عقل کی اعلیٰ شکل اور شاعری کو انسانی علم کی اعلیٰ صورت بتایا گیا لیکن یہ بات بھی صداقت پر مبنی ہے کہ اسی رومانی دور میں شاعری کو سائنس کی ضد بھی قرار دیا گیا کیوں کہ اس دور کی میکانکی مادیت میں جذبہ، تخیل ،حواس ،حسن ونغمہ اور رنگ و بو کی بالکل اہمیت نہ تھی لیکن رومانوی تحریک محض عقل پرستی کے خلاف ہی ردعمل نہ تھی بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف بھی سراپا احتجاج تھی، اسی تحریک کی بدولت سرمایہ دار ممالک بہت سی سماجی اصلاحات نافذ کرنے پر مجبور ہو گئے۔

۱۷۸۹ء کا انقلابِ فرانس رومانوی تحریک کے عروج کا زمانہ تھا اسی انقلاب کو رومان پسندوں کا ثمر قرار دیا جا سکتا ہے۔ ۱۷۸۹ء کے انقلابِ فرانس اور ۱۶۴۸ء کے برطانوی انقلاب میں اگرچہ بیشتر اقدار مشترک تھیں لیکن فرانس جن رومانوی تبدیلیوں سے دوچار تھا وہ تبدیلیاں برطانیہ میں اپنے تاریخی ارتقا کے اگلے مرحلے میں داخل ہو چکی تھیں جن میں اب سرمائے کی طاقت اور محنت کے استحصال کے ساتھ ساتھ مزدوروں کی خستہ حالی کا ایک نمایاں فرق سامنے آچکا تھا ۔ آزاد سرمایہ دارانہ تجارتی معیشت صنعتی سرمایہ داری کا روپ دھار چکی تھی ،جس سے ایک ایسا صنعتی کلچر وقوع پذیر ہوا جس میں طبقاتی ناہمواری موجود تھی۔سرمایہ دار طبقہ دولت ،طاقت اور اقتدار کی علامت بن گیا تھا لیکن مزدور غربت و افلاس اور انسانی حقوق سے محروم ہوتے چلے گئے اسی وجہ سے رومانویوں کے ہاں یاسیت ،انسانی بے بسی،زوال اور تقدیر پرستی جیسے موضوعات نے جادو جگانا شروع کر دیا جس کی وجہ سے اس کا سفر زوال کی جانب بڑھنا شروع

ہو گیا۔

ہندوستان میں رومانویت کی جڑیں بہت قدیم اور گہری ہیں ۔ہندوستان کی کلچرل رومانویت اور جدید رومانویت میں فرق دراصل ہندوستان اور یورپ کے سیاسی ،سماجی اور معاشی نظاموں کا فرق ہے۔جدید رومانویت یورپ کے سرمایہ دارانہ کلچر کے ساتھ پروان چڑھی جب کہ ہندوستان کے رومانوی کلچر کی بنیادیں مخصوص برہمنی کلچر میں موجود چھوت چھات اور ذات پات کے نظام کے زیرِ اثر پروان چڑھیں،گویا ہندوستان اور یورپ کی رومانویت میں بنیادی فرق یہ رہا تھا کہ ہندوستانی رومانویت کا تعلق وہاں کے مخصوص زرعی و مذہبی استحصالی نظام کے ساتھ رہا جب کہ یورپی رومانویت کا تعلق صنعتی نظام کے فروغ کے ساتھ وابستہ تھا۔

یورپ کا نشاۃِ ثانیہ پندرہویں اور سولہویں صدی میں ہوا جس میں دنیائے اسلام کی خدمات کو بھی خاصا دخل رہا ہے کیوں کہ گزشتہ صدیوں میں ہماری زندگی پر اسی دور کے علما اور شیوخ کی تصانیف اور تعلیم کا غلبہ رہا ہے اور ہمارے بعض علما نے مسلمان مفکرین کو ملحد اور علومِ طبیعہ کی ترقی کو مذہبی حوالے سے خطرناک قرار دیا ،اسی لیے عملاً ہم یورپ کے نہ صرف نشاۃِ ثانیہ ہی کٹے رہے بلکہ اس طرح ہم سائنس ،معقولات اور صنعت و حرفت سے بھی دور رہے۔ اس کے بعد یورپی سرمایہ داری یلغار نے مشرق پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے جس سے سرمایہ دارانہ نظام کے خصائص مشرقی خصائص کے ساتھ اس طرح گھل مل گئے کہ اچھے اور برے کا امتیاز ختم ہوگیا ۔ جنہیں آزادی عزیز تھی انہوں نے مغرب کے خلاف ایسا پروپیگنڈہ کیا کہ مغرب کی ہر شے حرام قرار دے دی گئی ۔مغربی تعلیم اور مغربی علوم وفنون کی ترویج و اشاعت سے جو ردِعمل مسلمانوں کے اندر پیدا ہوا وہ ایک منفی جذبہ تھا اور منفی جذبہ بہت جلد طاقت کے سامنے سرنگوں ہوجاتا ہے۔یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہمارے اندر مغرب کے خلاف نفرت نہ ہوتی تو کیا ہم بے دین ہوجاتے ؟اس نفرت اور منفی جذبے کا ہمیں نقصان یہ ہوا کہ ہم بھاپ اور بجلی کی ایک نئی طاقت جو یورپ کی صنعتی زندگی میں انقلاب لانے کا سبب بنی اس سے ہم محروم ہو گئے تھے۔

رومانویوں کے ہاں ماورائیت کے باوجود اچھوتے ،طاقتور ،پرشکوہ ،سرشار اور امید افزا خیالات کی ترسیل کی جاتی رہی ہے مگر ہندوستان کے ترقی پسندوں کے ہاں سماجی ذمہ داریوں کے تصورات کے باوجود سماجی منزل کا تعین مفقود ہے، اسی وجہ سے ان کے ہاں حقیقت نگاری قنوطیت کا باعث بنی کیوں کہ ان کے

ہاں ترقی پسند بنیادوں پر مثالی کردار نہ ہونے کے برابر تھے اسی لیے اس ترقی پسندی کا تعلق ہیومنزم کی تحریک سے تو منسلک کیا جا سکتا ہے مگر سوشلزم کے ساتھ نہیں جوڑا جا سکتا۔ ہومنزم کے ہاں عالمی معاشرے میں انسانی انفرادیت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے جب کہ سوشلزم میں ایک سماج میں موجود تاریخ کے ان مادی پہلوؤں کے متعلق گفتگو کی جاتی ہے جن کی بدولت ایک معاشرے کا طبقاتی نظام واضح ہوتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے موضوعات کا تعلق خواہ جنس نگاری سے ہو یا تقسیمِ ہند کے فسادات سے ان سب سے حقیقت نگاری اور واقعیت نگاری کے حوالے سے وہاں کام لیا گیا جہاں شعور، شعورِ محض دکھائی دیتا ہے یعنی ترقی پسندوں نے ایسے حقائق بیان نہیں کیے جو تلخ حقائق کو تبدیل کرنے پر مجبور کر دیں یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند ادب کی تخلیق اور اس کا مطالعہ ہمارے معاشرے کے مخصوص سا ڈسٹ رویوں کو بھی ظاہر کرتا ہے یعنی ایک دکھی فرد کے دکھ میں دکھی ہو کر یا اس کے دکھ کو احتساباتی سطح پر لے جا کر یہ ادب کتھارسز کا سامان فراہم کرتا ہے۔

بیتے لمحوں کے واقعات اور کہانیاں تاریخ کا حصہ بن جایا کرتے ہیں۔ ہر وہ واقعہ جو کسی اہمیت کا حامل ہو، تاریخ کی میراث ہوا کرتا ہے مگر تاریخ اور کہانی میں فرق صرف اتنا ہے کہ کہانی من گھڑت اور خود ساختہ بھی ہو سکتی ہے لیکن تاریخ ان واقعات پر مشتمل ہوتی ہے جو غیر جانب دار اور زیادہ سے زیادہ صداقت پر مبنی ہوں اسی لئے تاریخ میں ہمیشہ تخلیق کا در کھلا رہتا ہے۔ وہ تہذیبیں اور قومیں جو ہزاروں سال قبل صفحۂ ہستی پر نمودار ہوئیں ان کے حالات و واقعات کس طرح ہمارے سامنے آئے وہ بھی اسی قدر حیرت انگیز ہیں جس قدر موجودہ زمانے میں سائنس کی دلچسپ اور حیرت انگیز ایجادات۔

دنیا کی ابتدا سے لے کر موجودہ زمانے تک انسان مختلف ادوار سے گزر چکا ہے۔ ہر دور میں اس نے ترقی کی مختلف منازل طے کی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ہم زندگی کا ارتقائی حوالے سے جائزہ لیں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ انسان نے سب سے پہلے جنگلی اور وحشی زندگی سے آغاز کیا پھر آہستہ آہستہ خانہ بدوشی کی زندگی کی طرف سفر کیا، پھر اس کے اندر قبائلی احساس پیدا ہوا بستیاں بسائیں، قصبوں اور شہروں کی بنیاد ڈالی پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے نہ صرف زندگی کی ضروریات پیدا کیں بلکہ ایجادات، اختراعات اور مختلف علوم و فنون پر دسترس حاصل کر لی اس طرح اس کی فہم و فراست اور قوتِ ادراک میں بے پناہ اضافے ہوئے۔ تہذیب و ثقافت کا یہ قافلہ بڑھتا رہا اور تاریخ بنتی رہی۔ انسان کے عروج و زوال کے قصے،

اس کی معاشی اور معاشرتی ترقیاں، اس کے علوم و مذاہب کے کارواں اور اس کی تہذیب و تمدن کی کہانیاں تاریخ کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں۔اسی لئے زمانہ ماقبل تاریخ سے لے کر اب تک انسان نے جتنی ترقی کی منازل طے کی ہیں وہ ہمیں تاریخ نے ہی بتائی ہیں۔''ضرورت ایجاد کی ماں ہے'' کے مصداق انسان کی ارتقائی زندگی کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ انسان نے ہمیشہ مشکلات پر قابو پانے کی کوشش کی ہے اوروہ جیسے جیسے مسائل پر قابو پاتا گیا وہ متمدن اور ترقی یافتہ ہوتا گیا۔ دیگرمخلوقات سے برتری ہی انسان کے متمدن ہونے کا باعث نہ تھی بلکہ گھمبیر حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے بہادری اور حوصلے سے مشکلات پر قابو پانے نے انسان کو متمدن بنادیا ۔مذہب نے انسانی زندگی میں تہذیب و تمدن ،نظم و ضبط ،اصولوں،روایات و قوانین کی پاس داری ،مال و جان کی حفاظت اور ذمہ داری جیسی نمایاں صفات پیدا کر کے انسانوں کی اکثر ت کوتہذیب یافتہ بنادیا۔ ادب اور تہذیب وتمدن کے مدارج کے متعلق پروفیسر عمر زبیری کی رائے ہے:

> وادیٔ نیل ،وادیٔ دجلہ ،فرات اور وادیٔ سندھ کی زرخیزی نے انسانوں کوتہذیب و تمدن کے ابتدائی مدارج سے روشناس کرایا اور پھر ان ہی وادیوں میں حکومتیں قائم کیں ۔میمفس موہنجوداڑو اور بابل جیسے شہر آباد کیے گئے ۔ اہرام مصر کی حیرت انگیزتعمیرات بھی فنِ تحریر کی ایک ایجاد کا مقابلہ نہ کرسکیں اور انسان اپنا معلم آپ بن گیا کیوں کہ اس نے علوم وفنون ایجاد کیے اور قوانین بنائے ۔۴۳

قدیم ممالک میں مذہبی رجحانات کے ساتھ ساتھ فنِ تحریر کو بھی حیرت انگیز اور نہایت کار آمد طریقوں سے رائج کیا گیا۔ ابتدا میں تصویری رسم الخط ایجاد ہوا ۔مختلف شکلیں اور تصویریں بنا کر انسان اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگا مثلاً بھوک کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا تو انسان کی ایسی تصویر بنائی جاتی جس کا ایک ہاتھ منہ پر رکھا ہوتا یا پھر اس کے سامنے ایک خالی پلیٹ کی تصویر بنا دی جاتی جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ اس کے پاس کھانے کو کچھ نہیں ،پھر یہ تصویری رسم الخط مختصر ہوتے ہوتے نشانیوں تک محدود ہو گیا ۔مصریوں نے اس تصویری تحریر کی ابتدا کی تھی پھر آہستہ آہستہ ان نشانیوں نے حروف کی جگہ لے لی ۔ان نشانیوں سے حروف اور حروفِ ابجد تک کا یہ تحریری ارتقائی سفر صدیوں پر محیط ہے ۔فنِ تعمیر کے ایجاد ہونے کے ساتھ ساتھ کاغذ،قلم اور کالک کی روشنائی ایجاد کر کے مصریوں نے دنیاوی علوم کی داغ بیل ڈالی ۔ان کی

ضروریات ،مشاہدات اور تجربات تحریر میں آنے لگے ۔فنِ تعمیر کی اہمیت اور ارتقا کے متعلق اعجاز راہی کی رائے ہے:

> بادشاہوں کے کارناموں کو اور دیوتاؤں کے قصیدوں کو کاغذ کے رول پر اور مندروں کی دیواروں پر لکھا جانے لگا تھا۔مصر کے ساتھ ساتھ فنِ تعمیر سامری بابلی اور وادیٔ سندھ کے لوگوں نے بھی ایجاد کر لیا اور جن وادیوں میں تہذیب وتمدن کی ترقی ہوئی ان میں فنِ تعمیر کی اہمیت بھی بڑھتی گئی ۔۴۴

فنِ تعمیر کے ایجاد ہونے کے بعد سومیریوں کی توجہ اور دھیان تعلیم کی طرف ہوگیا اور تعلیم کا انتظام مندروں میں کیا جاتا تھا مندروں کے پروہت استاد بھی ہوتے تھے جو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ لکھنا بھی سکھاتے تھے اس کے علاوہ گرائمر، حساب،حکمت اور جراحی کی بھی ابتدائی تعلیم رائج ہوگئی تھی ۔سومیریوں نے ان ہی علوم پر توجہ دی تھی جو روز مرہ زندگی میں کام آتے تھے ۔

انسانی شعور عام معاشرتی اور معاشی تبدیلیوں کی رو میں بدلتا اورنئی راہوں پر گامزن ہوتا ہے اگر یہ بات درست ہے تو ادب کا کام بھی یہی رہ جاتا ہے کہ وہ انسانی شعور کو وسیع تر کرے لیکن یہ نہ بھول جائے کہ انسانی شعور بیرونی تغیرات سے بدلتا ہے،محض کسی ادیب کے کہنے یا اظہار کرنے سے نہیں بدلتا۔یوں ادب تہذیب کی بقا اور ارتقا میں شریک ہو جاتا ہے۔ادب ایک تہذیبی عمل ہے اور تہذیب کا کوئی ادارہ محض فرد کی کاوش کا مرہونِ منت نہیں ہے اس میں قوم کی زندگی کا دل دھڑکنا چاہیے۔ہر دور میں قومی تہذیب اور قومی زندگی ادب کو متاثر کرتی ہے لیکن اس کے انہیں حصوں کو پائیدار بنانے میں کامیاب ہوتی ہے جو اس وسیع تر نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں ، باقی حصے زیادہ سے زیادہ تاریخی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں ۔

قدیم تہذیب کے وہ اجزا جو انسان کی عظمت ،زندگی کی بقا اور جدو جہد کے مظہر ہیں ۔کسی نہ کسی شکل میں نئی تہذیبی قدروں میں بھی جگہ پائیں گے ان کے حاصل کرنے اور ان پر زور دینے کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن ان کا وجود ختم نہیں ہوسکتا یہ زندگی کے تسلسل کا پتہ دے گا اور ایک قوم کو اس کے ماضی سے تعلق رکھنے میں بھی معین ہو گا اور زبان ،ادب اور فنونِ لطیفہ اس تسلسل کو برقرار رکھنے میں بڑا حصہ لیں گے تہذیب ایک ملک کے فنونِ لطیفہ ،ادب، فلسفیانہ خیالات ،طرزِ معاشرت، مادی ترقی اور زندگی کے متضاد اور متصادم عناصر کو متوازن بنا کر اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی کا ایک خوش گوار احساس پیدا کرنے سے

الگ کوئی چیز نہیں ہے ۔ادب اور تہذیب کے متعلق پروفیسر احتشام حسین کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

> ادب ،تہذیبی ارتقا کا ایک جز اور اس کا ترجمان بن کر زندگی کی اس کشمکش کو پیش کرتا ہے جو کبھی فرد اور جماعت کی کشمکش کی شکل میں رونما ہوتی ہے ،کبھی جماعت اور جماعت کی کشمکش کی شکل میں ، اور ادب اس اظہار میں جس قدر زیادہ عمومی انداز اختیار کرتا یا زیادہ سے زیادہ لوگوں کی زندگی کا ترجمان بنتا ہے اسی قدر وہ تہذیب کے عمومی پہلوؤں سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔۴۵

اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ اور ادب کا آپس میں گہرا رشتہ ہے ۔ ایک مورخ نے خشک حقائق کو اس انداز سے پیش کرنا ہوتا ہے کہ وہ حقائق قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوں لیکن ہم یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ واقعات و حقائق کو ادبی تاثرات پر کسی صورت میں بھی قربان نہیں کیا جا سکتا۔ہمیں ایسی ادبی کتابیں بھی ملیں گی جنہیں پڑھ کر ہماری آنکھوں کے سامنے اس زمانے کی تہذیبی تاریخ کی ایک جھلک گھوم جاتی ہے ،ان کتابوں میں توبتہ النصوح ،فسانۂ آزاد، فسانۂ مبتلا وغیرہ کے نام آسانی سے لیے جاسکتے ہیں ۔ان کے مطالعہ سے دہلوی اور لکھنوی تاریخ کی ایک جھلک ہماری نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہے ۔منظوم تاریخ بھی لکھی گئی ۔تاریخ جن واقعات کو بیان کرتی ہے فن کار ان کی رنگین تصویر کھینچ دیتا ہے ۔اس لحاظ سے تاریخ اور ادب کا رشتہ خاصا پرانا ہے کیوں کہ سائنس سے دریافت شدہ حقائق کو ادبی رنگ میں پیش کرنا ضروری ہے

تاریخ کے اوراق ان واقعات کے مظہر ہیں کہ ارسطو کے زمانہ میں تاریخ ادب کا ایک حصہ بن گئی اور پھر یہ سلسلہ انیسویں صدی تک جاری رہا۔ ادبی دُنیا کے ہیرو مبالغہ آرائی سے کام لیتے رہے اور تاریخ میں تحقیق کے پہلو کا فقدان رہا ۔ایسی تاریخ کے متعلق لوگوں کے نظریات کا مختلف ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے لیکن تاریخی حقائق کو محض ادبی رنگ آمیزی پر قربان کردینا کسی طرح بھی مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا ،کیوں کہ ادب نام ہے اظہاروبیان کی بلندیوں کا نہ کہ پھوہڑ پن کا ،ادب نام ہے انسان اور فطرت اور خود انسان اور انسان کے درمیان مغائرت ختم کرنے کے لئے خوبصورت مساواتوں کی تخلیق کا ،ادب نام ہے آدمی کی منزل تک ارتقائی سفر اختیار کرنے کا تا کہ جب ثقافت اپنی ترقی اور تبدل کا فنی گراف بڑھانا چاہے تو ادب سماجی مورخ کا ہاتھ بٹائے ۔

اگر یوں کہا جائے کہ تاریخ انسان کے ان کار ہائے نمایاں کی داستان ہے جو اس نے معاشرے میں رہتے ہوئے سرانجام دیئے ہوں تو گویا انسان کا ہروہ عمل جو اس نے مہذب معاشرہ میں رہ کر سرانجام دیا ہے تاریخ کی روح ہے تو اس طرح تاریخ،ادب اور انسان ایک ایسی مثلث کی مانند ہیں جن کے تینوں زاویوں کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے تو گویا انسان دلچسپ واقعات بیان کرے گا تو وہ ادب ہو گا اور اگر حقائق کی گتھیاں سلجھائے گا تو تاریخ بنتی چلی جائے گی اور یوں زندگی کا سفر ارتقا اور اپنی منزل یعنی ابد کی طرف جاری و ساری رہے گا۔

تاریخ اپنے ماضی کو جاننے کا عمل ہے ۔تاریخ اور تہذیب کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے یعنی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تہذیبیں بگڑتی اور بنتی چلی جاتی ہیں اور یہی شکست و ریخت اور عروج وزوال کی داستان تاریخ کا حصہ بن جاتی ہے تو اس سے یہ بات سامنے آئی کہ ہم کسی طرح بھی تاریخی اور تہذیبی عمل کو علیحدہ علیحدہ نہیں کر سکتے ۔تاریخ اور تہذیب کا مطالعہ ہمیں ہزاروں سال پیچھے ماضی میں لے جا کر قدیم کلچر سے روشناس کرانے میں ممد ومعاون ثابت ہوتا ہے ۔

تاریخ اور تہذیب کی تلاش کا سفر دراصل انسانی وجود کو جاننے اور سمجھنے کا عمل ہی ہے۔ انسانی شخصیت کے اتار چڑھاؤ ،جذباتی مدوجزر ،تاریخیں اور تہذیبیں کس طرح جنم لیتی ہیں ؟ یہ سوال آج بھی اہلِ بصیرت کو دعوت فکر دے رہا ہے۔ کوئی بھی تہذیب محض چند دنوں میں جنم نہیں لے سکتی یہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں سالوں پر محیط انسانی کارگزاریوں کا سفر دکھائی دیتا ہے اور انسانی زندگی پر مشتمل صدیوں کا یہ سفر کچھ قواعد وضوابط وضع کرنے کا سبب بنتا ہے اور یہی قواعد وضوابط تاریخ وتہذیب کا حصہ بن جایا کرتے ہیں ۔گم شدہ زمانوں اور کہنہ آبادیوں کی دریافت جن کا تعلق ہماری تہذیبی تاریخ سے ہے اور انہیں وقت نے کس طرح شکست و ریخت سے دو چار کر کے تباہ و برباد کر دیا ہے یہی مطالعہ ہمارا مقصود ومحور ہے ۔

تہذیبیں ،افراد،واقعات ،انسانی نسلیں سب زمانے کی دھند میں گم ہو جاتے ہیں مگر وقت کا بہاؤ کبھی ختم نہیں ہوتا۔وقت ہی مختلف کرداروں کو منظرِ عام پہ لاتا ہے اور یہ کردار اپنا اپنا رول ادا کر کے وقت ہی کی لحد میں اتر جاتے ہیں ۔تہذیبیں بنتی ہیں اور مٹ جاتی ہیں ایک تہذیب پیدا ہوتی تو دوسری مر جاتی ہے لیکن وقت کبھی فنا نہیں ہوتا۔تہذیبی تاریخ کے دھارے جو اپنی مخصوص شناخت اور تشخص لیے ہوتے ہیں ۔تہذیبی تاریخ کے اسی سفر کو ایک بہتے ہوئے دریا کی صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہ دریا وقت کی

علامت اور فلسفہ کی خاص اصطلاح ہے جس طرح وقت رواں رواں ہے اسی طرح دریا برابر بہتا رہتا ہے ۔اسی دریا کے کنارے تہذیبیں پنپتی ہیں اور زوال کا شکار ہو جاتی ہیں۔ دریا کے پتھر اور چٹانیں ایک جگہ ٹھہرے رہتے ہیں ماضی کے ان نقوش کی طرح جو وقت گزرنے جانے کے بعد انسان کے حافظے میں محفوظ رہتے ہیں وقت نے اپنی رفتا ربدلی ،حالات بدلے،ماحول بدلا، پھر کیا ہوا؟ تہذیبیں بنیں اور مٹ گئیں ۔ عروج و زوال کی اس داستان میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ تہذیبی تاریخ کے اس سفرمس جہاں ہمیں پڑاؤ دکھائی دیتے ہیں وہاں نشیب وفراز بھی کم نہیں ہیں لیکن انسان نے کبھی ہارنہیں مانی اور جدوجہد کر کے دوبارہ اسی راستے پر آ گیا جو زندگی اور ترقی کا راستہ ہے ۔

چوں کہ وقت کو کبھی موت نہیں وہ زندگی اور موت کے چکر سے بے نیاز ہے اور اسی لیے وقت کو دریا کے بدلتے ہوئے روپ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ دریا خواہ، یادوں کا ہو، وقت کا یا آگ کیا اس کو پار کیا جا سکتا ہے تاریخ اورتہذیب کے مطالعہ سے انسانوں کا ذہنی وفکری ارتقا صدیوں کے طویل سفر کے ساتھ وقت کی گود میں پروان چڑھتا دکھائی دیتا ہے جہاں ہمیں تہذیبی تاریخ کے حوالے سے معاشرتی ، سیاسی، سماجی اورنفسیاتی زندگی کی بھر پور عکاسی دکھائی دیتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈی ڈی کوسمبی۔قدیم ہندوستان کی ثقافت و تہذیب،تاریخی پس منظر میں فیمس بکس لاہور ۱۹۸۹ء،ص:۴۵

۲۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر۔پاکستانی کلچر نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۱۹۹۷ء،ص:۴۱،۴۲

۳۔ سبطِ حسن۔ پاکستان میں تہذیب کا ارتقادانیال لاہور، ۱۹۹۶ء،ص:۱۳

۴۔ سلیم اختر،ڈاکٹر۔مضمون ''کلچر کی لہریں''مشمولہ ادب اور کلچرمکتبہ عالیہ لاہور،س ن،ص:۲۱۰

۵۔ وزیر آغا،ڈاکٹر۔مضمون ''ثقافت،ادب اور جمہوریت'' مشمولہ کلچر از اشتیاق احمد (مرتب) بیت الحکمت لاہور ۲۰۰۷ء،ص:۵۲۶

۶۔ سبطِ حسن۔مضمون (تہذیب سے تمدن تک) مشمولہ کلچر از اشتیاق احمد بیت الحکمت لاہور ۲۰۰۷ء،ص:۱۳۲

۷۔ زوار حسین۔تہذیب بیکن بکس ملتان۲۰۰۰ء،ص:۷۰

۸۔ امام مسلم بن حجاج القسیری۔ صحیح مسلم جلد:دوم حدیث نمبر:۲۹۵۰ المیز ان اردو بازار لاہور ۲۰۰۴ء،ص:۳۹۷

۹۔ http://www.mohenjodaro.net/mohenjodaro essay.html/

۱۰۔ محمد مجیب۔ دنیا کی تاریخ سٹی بک پوائنٹ کراچی ۲۰۰۹ء،ص:۷

۱۱ John H Marshal- "The Buddhist art of Gandhara:The story of early -school:its birth growth & Decline" Cambridge University Press 1960. p28

۱۲۔ ول ڈیوراں۔(مترجم:تنویر جہاں) انسانی تہذیب کا ارتقا (حصہ:اول) مکتبہ فکرو دانش لاہور ۱۹۸۹ء،ص:۷۸

۱۳ R.Mughal- "Recent archaeological research in cholistan desert" Harappa civilization:Delhi Oxford University Press. p:58

۱۴۔ محمد مجیب۔تاریخ تمدن ہند قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی ۱۹۹۹ء،ص:۲

۱۵ John Hubert Marshal- "Mohenjo-Daro and the Indus Civilization" Cambridge University Press (Ed-1931). p:5

۱۶۔ Do

۱۷۔ Do

۱۸۔ Do

۱۹ John Hubert Marshal- "A Guide of Texila" Cambridge University Press (Ed-4th 1960). p:12

۲۰۔ Do

۲۱ F.A.Khan, Dr. - "Contribution on Sindh's Archaeology Science Independence" Department of Archaeology Pakistan 1960. p:43

۲۲۔ مبینہ شاہین۔وادیٔ سندھ کی تہذیب کے لوگوں کی ثقافتی تاریخ تحقیقی مقالہ برائے ایم اے تاریخ پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۹۲ء،ص:۲۱

۲۳۔ رابرٹ بریفالٹ۔(مترجم:عبدالمجید سالک)تشکیل انسانیت مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ء،ص: ۱۳۶

۲۴ Oswald Spengler- "Decline of the West" Vol:1 Oxford University Press 1922. *P:85*

۲۵۔ یحییٰ امجد۔تاریخ پاکستان:قدیم دور سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۹ء،ص:۳۲۳

۲۶۔ سبط حسن۔پاکستان میں تہذیب کا ارتقا،ص:۹۲

۲۷۔ محمد عمر، ڈاکٹر۔ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر پاک اکیڈمی لاہور ۱۹۹۲ء،ص: ۳۴۷

۲۸۔ قرۃ العین حیدر۔آگ کا دریا سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۰ء،ص:۳۴

۲۹۔ جعفر ندوی۔مقالات ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور ۱۹۶۷ء،ص: ۲۴۵

۳۰۔ شیر محمد گریوال۔اسلامیانِ ہند کا شاندار ماضی اسلامی بک سروس لاہور ۱۹۸۹ء،ص: ۲۵

۳۱۔ محمد مجیب۔تاریخِ تمدنِ ہند نگارشات لاہور ۱۹۹۵ء،ص: ۶۲

۳۲۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر۔(مترجم) برِّ صغیر میں اسلامی کلچر ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور ۱۹۹۰ء، ص: ۱۲۱

۳۳۔ شیخ محمد اکرام۔پاکستان کا ثقافتی ورثہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور مارچ ۲۰۰۱ء،ص: ۲۴۵

۳۴۔ خاور جمیل۔ادب، کلچر اور مسائل رائل بک کمپنی کراچی ۱۹۸۶ء،ص: ۱۴۵

۳۵۔ صباح الدین عبدالرحمٰن۔ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے روہتاس بکس لاہور س ن ص: ۳۷۶

۳۶۔ قرۃ العین حیدر۔آخرِ شب کے ہم سفر سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۰ء،ص:۱۲۶

۳۷۔ شہزاد حسین۔(مرتبہ) افسانے نذر سنز لاہور ۱۹۹۲ء،ص: ۱۸۵

۳۸۔ ایضاً،ص:۱۸۶

۳۹۔ تارا چند، ڈاکٹر۔تمدنِ ہند پر اسلامی اثرات مجلسِ ترقی ادب لاہور ۲۰۰۰ء،ص: ۳۱۳

۴۰ Edward Michael- "British in India" London 1967. *P: 3*

۴۱۔ قرۃ العین حیدر۔میرے بھی صنم خانے سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۰ء،ص:۸۶

۴۲۔ شمیم احمد۔ناول نگاری کا غالب رجحان۔ تخلیقی ادب جلد: ۲ مینا پریس کراچی ۱۹۸۰ء،ص: ۳۲

۴۳۔ عمر زبیری، پروفیسر۔قدیم تہذیبیں اور مذاہب دارالشعور لاہور ۲۰۰۹ء،ص: ۲۰

۴۴۔ اعجاز راہی۔تاریخِ خطاطی ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ راول پنڈی ۱۹۸۶ء،ص: ۳۸

۴۵۔ احتشام حسین۔مضمون ادب اور کلچر مشمولہ کلچراز اشتیاق احمد بیت الحکمت لاہور ۲۰۰۷ء،ص: ۱۵۹

بابِ دوم

ناول کا تعارفی و تکنیکی مطالعہ

ناول ''جاگے ہیں خواب میں'' کا تعارفی مطالعہ

اختر رضا سلیمی کا ناول ''جاگے ہیں خواب میں'' بالکل ایک نیا ناول ہے۔اس ناول نے اپنے اندر کئی موضوعات سمیٹے ہوئے ہیں۔ اردو ادب میں ناول کئی ارتقائی تبدیلیوں کے بعد اب وہ صنف بن گیا ہے جس کا مقابلہ ہم مغربی ناول سے کر سکتے ہیں۔ شروع شروع میں اردو ناول بڑے سیدھے سادھے ہوتے تھے۔ اور ناول کو صرف ایک عشقیہ کہانی کی صورت میں آگے بڑھایا جاتا تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اردو ناول کا کینوس وسیع ہوتا گیا اور حتیٰ کہ اردو ادب میں کئی بین الاقوامی قسم کے ناول وجود میں آگئے جو کہ یقیناً اردو ادب کا قابل فخر سرمایہ ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا تفریح کے پہلو ختم تو نہیں ہوتے لیکن اس میں ایسے کارآمد عناصر جذب ہوگئے جو انسان کی حقیقی زندگی سے جنم لیتے ہیں۔

اگرچہ ناول میں رومان مکمل طور پر ختم نہیں ہوا لیکن اردو ناول میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زندگی اپنے تمام جذبات کے ساتھ ابھر کر سامنے آئی۔ پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

> ''قصے میں ڈرامائی رنگ، واقعات، ہنگامہ، قتل و خون اور شدید عشق و نفرت کے واقعات زیادہ ہوتے ہیں اچھے اچھے ناولوں میں یہ سب چیزیں اب بھی ملتی ہیں، مگر ناول کے رخ عمل سے کردار کی جانب، ہنگامی واقعات سے زیادہ تفسیر و تشریح کی طرف اور ظاہر سے باطن کی طرف ہوگیا ہے۔ رومانیت کی جگہ حقیقت نگاری نے لے لی ہے۔ ناول تہذیبوں کے ترجمان ہوتے ہیں۔ یورپ میں جب لوگ دورِ جاہلیت سے نکلے تو انہوں نے شیکسپیئر جیسا ادیب پیدا کیا''(۱)

اور پھر مغرب میں ادیبوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا۔ مغرب میں ناول کی تاریخ کافی پرانی ہے۔ اردو میں ناول کا آغاز بھی مغرب کے زیر اثر ہوا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ڈپٹی نذیر احمد نے اس صنف کا آغاز کیا۔ اس کے زیادہ تر ناول اصلاحی ہے جس میں مسلمان معاشرے کی اصلاح کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کے درمیان مکالمے اور کشمکش کی کیفیت بھی ملتی ہے۔ ناول ''ابن الوقت'' میں حجتہ الاسلام اور ابن الوقت دو ایسے کردار ہیں جو کہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں اور دونوں کے درمیان مکالمہ ہوتا ہے۔ بعد میں عبدالحلیم شرر نے کئی درجن تاریخی ناول لکھے جس میں ڈپٹی نذیر احمد کی طرح کردار مثالی ہوتے ہیں۔

عبدالحلیم شرر نے مسلمانوں کی تاریخ کو فکشنائز کیا ہے۔ پریم چند کا مقام و مرتبہ اس لحاظ سے بڑا ہے کہ وہ پہلا ادیب تھا جس کے ناول میں ہندوستان کی حقیقی زندگی نظر آتی ہے۔ اس کے افسانوں اور ناولوں میں کوئی تصوراتی دنیا یا مثالی کردار نہیں ہیں بلکہ ہندوستان کے باشندوں کی اصل تصویر نظر آتی ہے۔ پریم چند کے ہاں وطن کی مٹی سے محبت، اپنے تہذیب سے لگاؤ، سامراجی طاقت برطانیہ سے نفرت، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی یکساں ترجمانی ملتی ہے۔ پریم چند کے بعد اردو ادب میں بڑے بڑے ناول نگاروں کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے جس میں عزیز احمد ، قراۃ العین حیدر، فضل کریم فضلی، شوکت صدیقی، احسن فاروقی، عبداللہ حسین، جمیلہ ہاشمی، خدیجہ مستور، ممتاز مفتی، رحیم گل، انتظار حسین، بانو قدسیہ، مستنصر حسین تارڑ، عصمت چغتائی، اوپندر ناتھ اشک، شمس الرحمان فاروقی، مرزا اطہر بیگ اور اختر رضا سلیمی ہیں۔ مذکورہ ادبی اردو ادب کا قابل فخر سرمایہ ہے جنہوں نے سینکڑوں ناول لکھ کر اردو ادب کو ایک عالمی مقام دیا۔ اختر رضا سلیمی بھی اس سلسلے کا ایک نوخیز شاعر و ناول نگار ہے۔ اس کے ابھی تک، دو ناول منظر عام آ چکے ہیں۔ جس میں ایک جاگے ہیں خواب میں اور دوسرا جندر ہیں۔ دونوں ناولوں کو اردو ادب کے ناقدین نے خوب سراہا۔ اختر رضا سلیمی کا ناول جاگے ہیں خواب میں ایک ایسا ناول ہے۔ جہاں حیرت ہی حیرت ہے۔ اختر رضا سلیمی نے ناول کے آغاز میں غالب کا یہ شعر لکھا ہے۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم مشہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

یہ ناول مارچ ۲۰۱۵ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ اختر رضا سلیمی نے یہ ناول اپنے دوست نعمان فاروق کے نام کیا ہے۔ جس کے نیچے یہ شعر درج ہے۔

کہاں سے آئے ہیں ہم لوگ یہ نہیں معلوم
مگر یہ طے ہے بہرحال اس جہاں کے نہیں

اختر رضا سلیمی نے اس کے ذریعے انسانی ذہن کے مختلف جہات کو آشکار کیا ہے۔ جس میں انسانی ذہن کی پر اسراریت اور پیچیدگی نمایاں ہوتی ہے۔ اس ناول میں قاری انسانی زندگی سے متعلق طبیعاتی اور مابعد الطبیعاتی بھیدوں سے واقفیت حاصل کر لیتا ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انسان جو کائنات کو مسخر

کرنے کے درپے میں خود اپنے اندر کتنا پیچیدہ اور پراسرار ہے۔ اختر رضا سلیمی کا یہ ناول اردو ادب میں طبیعات کے ساتھ ساتھ مابعد الطبیعاتی حقائق تک رسائی کے لیے پہلی کامیاب تخلیق ہے۔

اس ناول کا مرکزی کردار زمان ہے جو کہ اسلام آباد کے کسی یونیورسٹی میں طبیعات کا طالب علم ہے۔ جو کہ حد درجہ ذہن اور تجسس مزاج طالب علم ہے۔

اردو کے دیگر اصناف کو چھوڑ کر ناول لکھنا بڑے دل گردے والوں کا کام ہے۔ کیوں کہ کبھی کبھی ایک ناول کو لکھنے میں ناول نگار کو کئی برس محنت کرنی پڑتی ہے۔ یہ ایک نازک اور باریک کام ہے جب ناول نگار ناول کا آغاز کرتا ہے تو پلاٹ کا خیال رکھنا پڑتا ہے کرداروں پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ کہانی کو چلانا ہوتا ہے اور موجودہ زمانے میں محض ایک سیدھی سادی کہانی کو ناول نہیں کہا جاتا بلکہ بڑے ناول وہ ہوتے ہیں جس میں معاشرہ کے کئی جہتوں کا مشاہدہ کیا گیا ہوں۔ اس کے علاوہ اس میں سماجی علوم کے ساتھ ساتھ نیچرل سائنس پر بھی بات ہوئی ہوں۔ تب جا کے ناول ناقدین کے نظر میں آجاتا ہے اور وہ اس کو اپنے تنقیدی آراء سے شہرت دیتے ہیں۔ اس طرح کے ناولوں میں ایک ناول جو ایک خوبصورت شاعر اختر رضا سلیمی نے تخلیق کیا ہے۔ جس کا نام تب سمجھ میں آتا ہے جب قاری ناول کو شروع سے آخر تک مطالعہ کرتا ہے۔ اور قاری سمجھتا ہے کہ واقع میں اختر رضا سلیمی نے یہ نام مناسب رکھا ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ مذکورہ ناول اب اردو کے بڑے ناولوں میں شمار ہونے لگا ہے اور اس کی وجہ سے ناول کی کہانی، مربوط پلاٹ، کردار، مختلف سماجی و سائنسی علوم پر مباحث ، تاریخ وتہذیب کی زبردست کارفرمائی اور نفسیات کے پیچیدہ مباحث ہے جو کہ قاری کو ایک پراسرار دنیا کی سیر کراتی ہے۔ اور جب قاری جب ناول کو پڑھتا ہے تو حیرتوں کا ایک جہاں اس پر کھلتا ہے اور وہ سلیمی کے اس عجیب وغریب کارنامے کو داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ناول کی کامیابی کے حوالے سے محمد شعیب لکھتے ہیں:

> کئی ادیب ایسے دیکھے گئے ہیں جنہوں نے ناول کا ڈول ڈالا، مگر یہ خالی ہی واپس آیا۔ ایسے میں جدید عہد میں سامنے آنے والے گنے چنے ناول بھی غنیمیت ہیں۔ ان چند ناولوں میں ایک نیا جہاں آباد کرنے کے ساتھ، ادب کو نئی سمت سے آشنا کرنے کی سعی ملتی ہے۔ زندہ رہنے والے ایسے ہی ناولوں میں ایک نیا اضافہ ”جاگے ہیں خواب میں“ ہے۔ جسے اختر رضا سلیمی نے تحریر کیا ہے۔ ۲۴۷ صفحات پر مشتمل یہ

> ناول دستاویز پبلی کیشنز، لاہور نے ۲۰۱۵ء میں شائع کیا۔ اب تک لکھے جانے والے ناولوں میں موضوعی اعتبار سے اس تخلیق کو بجا طور پر معاصر ادب میں ایک اضافہ سمجھا جائے گا۔(۲)

جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ کئی ناول کی کامیابی میں بڑا کردار مرکزی خیال کو حاصل ہوتا ہے اس خیال کو سامنے رکھتے ہوئے ناول نگار کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں اور تجسس کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ محمد شعیب لکھتے ہیں:

> کوئی بھی ناول کہانی کے بغیر اپنا بہتر تاثر قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ کہانی میں مرکزی خیال ہر لحہ مصنف کے ذہن میں رہتا ہے۔ جس سے کہانی میں نئی جان ترتی ہے اور مصنف کے قدم مستقل مزاجی سے اپنی منزل کی جانب گامزن رہتے ہیں ۔مرکزی خیال ہی وہ غنچہ ہے جسے پھول بنانے کے لیے ناول نگار کہانی کا سہارا لیتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر مرکزی خیال کو کہانی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے، جب کہ کہانی کو ناول میں یہی مقام حاصل ہے۔ ناول نگار کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہوتی ہے کہ وہ قاری کو ہر لحہ اپنی گرفت میں رکھے، یہ مقصد تجسس کے ذریعے حاصل کیا جاسکتا ہے۔(۳)

اردو ناول کو پڑھتے ہوئے کبھی بھی یہ احساس ہوتا ہے کہ اگرچہ تخلیق کار کے موضوعات کبھی کبھی بہت بڑے ہوتے ہیں لیکن پلاٹ ڈھیلا ڈھالا ہوتا ہے۔ نت نئے کردار سامنے آتے ہیں اور اچانک آتے ہیں جس کی وجہ سے قاری بعض اوقات پریشان ہوتا ہے اور تجسس کی وہ کیفیت نہیں ہوتی جو ہونی چاہیے۔ سلیمی کے ناول کی کامیابی کی ایک وجہ مربوط پلاٹ اور کہانی میں تجسس کی کیفیت ہے۔ عظیم الشان صدیقی لکھتے ہیں:

> قدرت نے انسان میں تجسس کا مادہ ودیعت کیا ہے۔ اس بنا پر وہ کچھ جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ چناں چہ ایک کہانی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ سامعین یا قاری کے اس ذوق تجسس کو برقرار رکھے اور وہ ہر لحہ یہ معلوم کرنے کے لیے بے قرار رہے کہ پھر کیا ہوا؟ یہ سوال جس قدر شدید ہوگا اس قدر کہانی زیادہ کامیاب

> کہلائے گی اور اگر اس جذبے کو ابھارنے میں ناکام رہی تو وہ کہانی کی سب سے بڑی خامی ہوگی۔(۴)

''جاگے ہیں خواب میں'' ایک کثیر الجہت اور کثیر الموضوعاتی ناول ہے۔ جس میں جابجا طبیعات، مابعد الطبیعات، فلسفہ اور تاریخ و تہذیب کے مباحث ملتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> اس نے اپنی کلائی میں بندھی گھڑی پر وقت دیکھا ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ وقت اور خلا ایک دوسرے سے بندے ہوئے ہیں ہم اس وقت تک خلا میں نہیں دیکھ سکتے جب تک پیچھے مڑ کر وقت میں نہ دیکھیں۔ اس نے خلا میں گھورتے ہوئے سوچا۔ پھر اس نے اپنی آنکھوں کی پتلیوں کو ہلکا سا جنوب کی سمت گھمایا اور دب اکبر (Big Dipper) کو تلاش کرنے لگا۔ جس کے بارے میں اس نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ اس کی عمر صرف دس لاکھ سال ہے اور اس دوران میں کئی شکلیں بدل چکا ہے۔(۵)

کائنات انسان کی سوچ سے بھی زیادہ وسیع ہے اس کا اندازہ جدید سائنس کو پڑھ کر لگایا جاسکتا ہے۔ جب انسان کو صرف اپنے سیارے یعنی زمین کے متعلق علم تھا اور وہ کائنات کی وسعت سے ناواقف تھا تو وہ سوچ رہا تھا کہ شاید ہم کائنات کے بڑے حصے پر قابض ہیں۔ اور یہ کہ ہماری زمین سب سے اہم اور بڑی ہے لیکن بیسویں اور اکیسویں صدی میں جب انسان نے کائنات کے بارے میں کچھ علم حاصل کیا اور طاقتور دوربینوں کے ذریعے کائنات کے ایک معمولی حصے کا مشاہدہ کیا تو انسان کی حیرتوں کی انتہا نہ رہی، اور وہ جو احساس برتری اور تکبر میں مبتلا تھا مبہوت ہو کر رہ گیا۔ جب اس کو پتا چلا کہ ہم کائنات کے ایک چھوٹے سے حصے پر آباد ہیں اور یہ کائنات شاید ہماری خیال سے بھی بہت بڑی ہے۔ کیوں کہ کائنات میں ایسے سیارے اور ستارے موجود ہیں۔ جو زمین سے کئی کروڑ گنا بڑے ہیں اور زمین سے اس کا فاصلہ لاکھوں نوری سال ہیں۔ روشنی ایک سیکنڈ میں جس رفتار سے سفر کرتا ہے وہ کئی ہزار میل ہے اور اگر روشنی یہ سفر ایک سال میں کریں تو وہ ایک نوری سال کہلایا گا۔ اختر رضا سلیمی نے ناول میں کائنات کے اس وسعت کو کچھ حد تک واضح کیا ہے جو کہ کافی دلچسپ اور حیران کر دینی والی ہے۔ لکھتے ہیں:

> اس نے چاند سے نظریں ہٹا کر دوبارہ الدبران پر نظریں مرکوز کرلیں، جو اس کے نصابی علم کے مطابق زمین سے پینسٹھ نوری سال کے فاصلے پر تھا۔ یہ کرنیں ۱۹۶۰ء

> میں وہاں سے روانہ ہوئیں تھیں۔ جب ساری دنیا کو دوسری جنگ عظیم کی آگ میں جھونکا جاچکا تھا۔ اس نے الدبران پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے پورے وثوق سے سوچا اس کا مطلب ہے کہ ناگاسا اور ہیروشیما سے بلند ہونے والے شعلوں کی روشنیاں پانچ سال بعد الدبران پر پہنچیں گی۔ اس نے حساب لگایا۔لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ انہی دنوں جب ہیروشیما اور ناگا سا تباہ ہو رہے تھے، الدبران ایک دھماکے سے پھٹ گیا ہو اور اس کا مادہ خلا میں بکھر گیا ہو۔اگر ایسا ہو چکا تو مجھے اس کا نظارہ کرنے کے لیے ۲۰۱۰ء میں جانا ہوگا۔ اس نے خیالوں ہی خیالوں میں بات آگے بڑھائی۔(٦)

سائنس دان اس بات پر تحقیق کر رہے ہیں کہ ہم اپنے ماضی کو دوبارہ دیکھ سکتے ہیں اور آیا کیا ہم مستقبل میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ کائنات میں کوئی جگہ ایسی ہے جہاں ہم ماضی کے ساتھ مستقبل میں بھی جھانک سکے گے۔ کائنات کے ان رازوں پر مغربی سائنس دان دن رات محنت کر رہے ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے یہ سوالات اپنے ناول میں اٹھائے ہیں۔ کہتے ہیں:

> کیا کائنات میں کوئی ایسی جگہ بھی ہے جہاں دیکھنے والا ماضی کے ساتھ ساتھ مستقبل میں بھی جھانک سکے؟ کیا میں کسی ایسے ستارے کو بھی دیکھ سکتا ہوں جو ہزار سال بعد وجود میں آئے گا؟ نہیں تو کیوں؟ اگر میں اربوں سال پہلے بننے والے ستاروں کو اسی طرح آسانی سے دیکھ سکتا ہوں جیسے وہ ہزاروں سال پہلے تھے تو ایسا کیوں ممکن نہیں؟ وہ جیسے سوچتا مزید الجھتا جاتا۔(۷)

اختر رضا سلیمی کے ناول میں کائنات کے حوالے سے اسی طرح سوالات جابجا ملتے ہیں جس سے ناول نگار کے سائنسی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ وقت، روشنی کی رفتار، خلا، سیارے، ستارے، چاند، سورج، بگ بینگ اور الدبران جیسے اصطلاحات بار بار استعمال ہوئے ہیں۔

> دنیا کا سب سے بڑا عجوبہ روشنی کی ماہیت اور سب سے بڑا اسرار اس کی رفتار ہے۔ وہ اپنی نگاہیں الدبران سے ہٹا کر چاند پر مرکوز کرتے بڑبڑایا یقیناً اسی رفتار کے اسرار میں خلا اور وقت کے درازے کی چابی ہے۔۔۔ اور اس چابی تک رسائی روشنی کی

> رفتار میں ضم ہو کر ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس نے اپنی سوچ کا تسلسل برقرار رکھتے ہوئے خود کلامی کی۔ اگر میں کسی کرن کی رتھ پر سوار ہو جاؤں تو ۔۔۔!!! اس نے فرض کرتے ہوئے سوچا۔۔۔ تو میں ساری عمر ایک لمحے میں گزار سکتا ہوں۔ جیسے بگ گینگ سے پھوٹنے والا ایک فوٹان، جس کی عمر اب بھی اتنی ہے جتنی بگ بینگ کے وقت تھی۔(۸)

اختر رضا سلیمی ناول میں مذہب اور سائنس کے اہم مباحث بھی کرتے ہیں مذہب کا سارا دراومدار روح پر ہے ۔ مذہب کا کلام روح سے ہے لیکن نیچرل سائنس روح کے متعلق خاموش ہے۔ نیچرل سائنس عام طور پر چیزوں کے بارے میں فیصلہ دے دیتی ہے جس کا ادراک خواس خمسہ سے ہم کر سکتے ہیں۔ ہر وہ چیز جس کا ادراک ہم خواس خمسہ سے نہیں کر سکتے۔ سائنس اس حوالے سے خاموش ہے۔ اس وجہ مذہب کا انحصار جن چیزوں پر ہے جیسے جنت دوزخ، فرشتے، تقدیر اور روح وغیرہ سائنس کبھی اس حوالے سے کچھ نہیں کہتا۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں جب مذہبی ادارے کمزور ہوتے چلے گئے اور لوگ پوپ اور پادری کی علم و سائنس دشمنی کی وجہ سے مذہب سے آہستہ آہستہ دور چلے گئے ۔ ریاست میں مذہب کا کردار محدود کیا گیا جس کا یہ اثر ہوا کہ مغرب نے کھل کر نیچرل سائنس کی ترویج وتبلیغ اور تحقیق میں حصہ لیا۔ اور نیچرل سائنس کے ذریعے انسان نے کائنات کے قوتوں کو مسخر کرنا شروع کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب کا انسان مذہب سے دور ہوتا چلا گیا اس نے پادری کے بجائے جدید میڈیکل سائنس سے اپنے مسائل حل کرنا شروع کیے۔ اس کا نتیجہ تو یہ ہوا کہ انسان کے مشکلات کم ہوتے ہوگئے۔ بہت سارے وبائی امراض پر قابو پایا گیا۔ مشین نے انسان کے کام کو آسان کیا۔ ہزاروں بیماریوں کی تشخص اور علاج ممکن ہوئی۔ اور دنیا ایک گلوبل ویلج میں تبدیل ہوئی لیکن نقصان یہ ہوا کہ انسان نے سائنس کو ایک دوسرے کی تباہی کے لیے استعمال کیا۔ ایسے ہتھیار تیار کیے گئے جو دنیا کو منٹوں میں تباہ و برباد کرسکتی ہے۔ عالمی سامراجی قوتوں کے درمیان مادی دوڑ شروع ہوئی۔ اور دنیا میں غریب اقوام کا مادی استحصال شروع ہوا ۔ سامراجی ممالک نے مادی فوائد کے لیے ایک دوسرے پر بھی تابڑ توڑ حملے کیے۔ پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم میں ایک سو ملین لوگ مارے گئے یا زخمی ہوئے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ دنیا کے معلوم تاریخ میں ساری جنگوں میں اتنے لوگ نہیں مارے گئے تھے جتنے لوگ ان دو جنگوں میں مارے گے۔ یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی غلطی نہیں ہے

بلکہ انسانوں کی اپنی غلطیاں ہیں اور خاص وہ مجرم سرمایہ دار ٹولہ جو اپنے مادی مفادات کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اس وجہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا روح ووح کی چکر سے تو نکل گئی لیکن کیا اب دنیا محفوظ ہوگئی ۔سائنس اور روح کے مباحث اختر رضا سلیمی کے اس ناول میں ملتے ہیں۔

میڈیکل سائنس روح ووح کے چکر کو تو نہیں مانتی۔ البتہ انسانی ذہن کی پر اسراریت کی پوری طرح قائل ہے۔ اور اسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید انسان نے اپنے معروض کے متعلق بہت علم حاصل کیا۔ اس نے بادلوں کو مسخر کیا۔ پانی کے رخ کو بدل دیا۔ سمندروں اور دریاؤں پر تسلط قائم کیا۔ ہواؤں میں جہاز اڑائے۔ جانوروں اور پودوں پر ہزار ہا تحقیقات کیے، لیکن انسان نے جس ذہن کے ذریعے یہ سب کام کیے ۔ اسی ذہن کے بارے میں بہت کم جان پایا ہے۔ اختر رضا سلیمی لکھتے ہیں؛

> آپ نے سائنسی ترقی کی بات کی ہے ۔ بات یہ ہے کہ سائنس نے ابھی تک میرے خیال میں صرف طبیعات کے میدان میں زیادہ ترقی کی ہے۔ اس نے انسان کے صرف معروض کو بدلا ہے۔ اندر سے انسان اب بھی وہی ہے۔ وہی۔ غاروں میں رہنے والا۔ ابھی تک سائنس کی رسائی انسان کے باطن تک پوری طرح ممکن نہیں ہو پائی ہے۔ ہمیں جو ترقی نظر آ رہی ہے وہ ہمارے اردگرد ہوئی ہے۔ میرے سامنے بیٹھا ایک انسان کیا سوچ رہا ہے؟ کیوں سوچ رہا ہے؟ کیسے سوچ رہا ہے؟ ایک ماہر نفسیات ہونے کے باوجود میں اس سے بے خبر ہوں۔ میرے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا عجوبہ بل کہ میں اسے معجزہ کہوں گا۔ انسانی دماغ ہے۔ دنیا میں اب تک جتنی ترقی ہوتی ہے۔ وہ سب اسی دماغ کی مرہون منت ہے۔ لیکن خود دماغ کیسے کام کرتا ہے، اس کے بارے میں ہم فی الحال بہت کم جان پاتے ہیں اتنا کم کہ شاید وہ قابل ذکر بھی نہ ہو۔ ہم مستقبل میں اس کے بارے میں کتنا جان پائیں گے۔ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ سولومن سنائیڈر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ہم انسانی دماغ کو پوری طرح کبھی سمجھ ہی نہیں پائیں گے ڈاکٹر فاروقی بغیر کوئی وقفہ بولتے چلے گئے۔(۹)

مغرب نے اگر چہ انسان کے روحانی مسائل، اور نفسیاتی مسائل کی طرف کم توجہ دیا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہاں اب نفسیات ایک مستقل شعبہ بن چکا ہے، جس میں انسانی ذہن کی پیچیدگی کے حوالے سے تحقیق ہو رہی ہے۔ مغرب میں اب ایسے لوگ پیدا ہوگئے جو روح اور مذہب کے متعلق بھی سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں۔ اور اس بات پر تحقیق ہو رہی ہے۔ کہ کیا روح موجود ہے؟ مذہب کیا ہے؟ اس کا انسان کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ کیا مذہب کے بغیر انسان دنیا میں خوش ہوسکتا ہے؟ دنیا بھر کے مذاہب کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ کیا اخلاقیات کا ماخذ مذہب ہے یا عقل؟ یہ سوالات اگر چہ سماجی ماہرین کو درپیش ہے لیکن نیچرل سائنس نے بھی کچھ چیزوں پر غور وفکر شروع کیا ہے۔ کہ کیا کائنات میں انسان کے علاوہ کوئی دوسری مخلوق موجود ہے؟ اڑن طشتری کیا ہے؟ یہ کس طرح اڑتی ہے۔ اس میں کونسی مخلوق موجود ہوتی ہے؟

کیا انسان کائنات کا طاقتور اور ذہین مخلوق ہے؟ یا کوئی دوسری مخلوق موجود ہے؟ ہم ان تک رسائی کر سکتے ہیں؟ اسی طرح کے سینکڑوں سوالات جدید سائنس کو درپیش ہیں۔ اسی طرح انسانی ذہن کے متعلق بہت سارے سوالات بدستور موجود ہیں۔ کہ کبھی کبھی دنیا میں موجود ایسے انسان بھی پائے گئے جنہوں نے وہ کام کیے کہ میڈیکل سائنس کسی طرح ماننے پر آمادہ نہیں ہے۔ کہ وہ کام بعید از عقل تھے۔ یہ کام میڈیکل سائنس کے لیے ایک چیلنج سے کم نہیں۔ ناول میں جب ڈاکٹر فاروقی انسانی ذہن کے پیچیدگی کے حوالے سے بات کرتے ہیں جس کو راقم نے اوپر نقل کیا ہے تو زمان کے والد عزیز خان حیرت میں مبتلا ہوتا ہے اور تجسس کے مارے سوال کرتا ہے

> کیا میڈیکل سائنس کی تاریخ میں ایسی مثالیں پہلے بھی موجود ہیں؟ بالکل ایسی نہ سہی۔ لیکن اس سے ملتی جلتی کئی مثالیں موجود ہیں۔ میرے خیال میں قریب ترین مثال مولی فانچر نامی ایک عورت کی ہے۔ جس کی پچاس سالہ زندگی میں ایسے کئی واقعات پیش آئے، جنہوں نے اسکے معالجین کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس کے دونوں معالج ڈاکٹر رابرٹ سپائر اور ڈاکٹر جارج سارجنٹ اپنے وقت کے ممتاز ماہر ذہنی امراض تھے۔ لیکن وہ کبھی اس کی توجیہ پیش نہیں کر سکے۔ جب اس کے بارے میں اخبارات میں خبریں چھپی تھیں تو بہت سے لوگوں نے ان پر یقین نہیں کیا۔ ایسے لوگوں میں مشہور فلکیات دان ہنری پارفرسٹ بھی تھا۔ وہ خصوصی طور پر ان سے ملنا گیا تھا۔ وہ

> کئی روز تک اس کے ساتھ رہا اور ایک ہی تجربہ بار بار دھراتا رہا۔ وہ ایک خط لکھ کر لفافے میں بند کر دیتا۔ اور مولی بغیر لفافہ کھولے اسے بتا دیتی کہ خط میں کیا لکھا ہے، اور کس انداز میں لکھا ہے۔ ہنری کو شبہ ہوا کہ مولی اس کا ذہن پڑھ لیتی ہے۔ اپنے اس شبے کو دور کرنے کے لیے اس نے ایک پرانی فائل کا ایک صفحہ بغیر دیکھے نکال لیا کہ خود اسے بھی اس کے مندرجات کا علم نہ ہو پائے۔ لیکن اس نے لفافہ آگے کیا تو اس کا شبہ دور ہوگیا مولی نے بغیر لفافہ کھولے اسے بتا دیا کہ صفحے پر کیا لکھا ہے۔ ہنری نے لفافہ کھول کر دیکھا تو ایک حرف بھی آگے پیچھے نہیں تھا۔(۱۰)

مشہور نقاد ممتاز احمد خان نے اختر رضا سلیمی کے اس ناول جاگے ہیں خواب میں تشکیک اور یقین کی حیرت انگیز کتھا'' کے نام سے ایک طویل مضمون لکھ کر ناول اور ناول نگار کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ممتاز احمد خان نے اس ناول کو اردو ادب میں ایک کامیاب اضافہ قرار دیا ہے اور اپنے مضمون میں ناول کے نادر موضوعات کی وجہ سے ناول کو سراہا ہے۔ لکھتے ہیں۔

> یہ عنوان ہمارے آج کے قاری کو یقیناً چونکا دینے کی کیفیت میں مبتلا کرتا ہے۔ شاعر اور ناول نگار اختر رضا سلیمی نے اس دلچسپ عنوان کے ذریعے ایسی جہات کو آشکارا کیا ہے جو اپنی تفہیم کے حوالے سے ہمارے ذہن کو پراسراریت سے معلو پگڈنڈیوں، وادیوں اور پر پیچ راستوں کے طبعیاتی اور مابعد الطبعیاتی بھیدوں سے واقف کراتا ہے۔ یہ ایک جدید ناول ہے جس کے قصے کے ایک سرے پر محیر العقول واقعات پشتادہ ہے جو کسی غیر مرئی طاقت کی کارفرمائی کے نتیجے کے طور پر وجود میں آتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں تو دوسرے سرے پر انسان کے دریافت شدہ مخفی وغیر مخفی علوم کی افادیت کا پتہ چلتا ہے۔(۱۱)

اختر رضا سلیمی کے اس ناول پر ژونگ کے نظریہ لاشعور کا اثر نمایاں ہے۔ جس میں مرکزی کردار باپ دادا سے ہوتے ہوئے پشت در پشت اپنے لکڑ داد کے دور میں چلا جاتا ہے۔ اور ان کے روپ میں مختلف جگہوں پر مختلف کام کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ممتاز احمد خان لکھتے ہیں۔

> اس ناول کی پراسرار مگر دل چسپ دنیا کی سیر کرنا ہر قسم کے قاری کے لیے ایک نہ

> بھلایا جانے والا مطالعاتی تجربہ ہوگا۔ اس کا ہیرو زمان اور اس کے خاندان کی جنیاتی یادوں کا سلسلہ پڑھنے والے کو تاریخ میں دور دراز کے علاقوں اور واقعات کا نہ صرف شعور عطا کرتا ہے بلکہ زبردست حیرت میں بھی مبتلا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کائنات کے رازوں کی ازسرنو تفہیم کے کرب سے بھی دوچار کرتا ہے۔اس سلسلے کا کلیدی کردار زمان ہے جو ۲۰۰۵ء کے زلزے میں زخمی ہو کر کومے میں چلا جاتا ہے۔ کومے کے دوران وہ ایک طویل خواب سے دوچار ہوتا ہے۔ اسلام آباد کی ایک بڑی ہسپتال کے ڈاکٹر اسے ہوش میں لانے میں تو کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن اسے خواب سے باہر لانے میں ناکام رہتے یں۔ جس سے وہ کومے کے دوران دوچار رہتا ہے۔ یوں ہوش میں آنے کے بعد وہ اپنا ماضی بھول جاتا ہے اور کومے کے دوران دیکھا ہوا خواب اس کا ماضی بن جاتا ہے۔(۱۲)

ممتاز احمد خان نے ناول کے اس تکنیک کو بالکل نادر قرار دیا ہے اور اس ناول کے فکر انسانی ذہن کے سائنسی حقیقتوں کے قریب تر قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> اختر رضا سلیمی نے اس نئے تکنیک کے ذریعے اپنے مرکزی کردار زمان کے خاندان کے طویل تاریخی سلسلوں کو ناول کے قصے میں گوندھ کر جس سلیقے سے بیان کیا ہے۔ وہ بظاہر تو حیرت انگیز اور ناقابل تصور ہے مگر انسانی ذہن کی سائنسی حقیقتوں سے نہ صرف قریب تر ہے بلکہ آنے والے دور میں نئے انکشافات کے دروازے بھی کھول سکتا ہے۔(۱۳)

اختر رضا سلیمی نے ایک دوسرا عالمانہ اور فلسفی مزاج کردار عرفان تخلیق کیا ہے جو صاحب مطالعہ کم گو اور درویش صفت انسان ہے۔ عرفان پر گوتم بدھ کے شاگرد آنند کے خیالات کا اثر ہے۔ اور وہ طبعی علوم کے ساتھ مابعد الطبیعاتی علوم کو بھی اہم گردانتے ہیں۔ وہ بظاہر ایک عام سا شخص ہے جسے گاؤں کے لوگ شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس کے کندھے سے ہر وقت تھیلا لٹکا رہتا ہے۔ جس پر ''غاوسہ فردوس'' الفاظ درج ہیں اس کے تھیلے میں سگریٹ اور بوسیدہ کتابیں ہوتی ہیں۔ عرفان ایک ایسی نبض شناس شخصیت ہے کہ اس نے زمان کے تجسس مزاج طبیعت کو پہچان لیا اور طبیعات و مابعد الطبیعات کے علاوہ دیگر مخفی علوم سے زمان

کو روشناس کرایا۔ عرفان کا خیال ہے کہ جتنے بھی طبیعاتی علوم ہیں اس نے مابعد الطبیعات کی گود سے جنم لیا۔ اس کے خیالات کچھ یوں ہیں:

> تمام کی تمام نظری سائنس مابعد الطبیعاتی ہے۔ طبیعات نے مابعد الطبیعات کی گود سے جنم لیا ہے۔ یعنی یہ معاملہ روحانی ہے یہاں تک کہ آئن سٹائن کی تھیوری E-mc2 بھی۔ ہاں۔ میں اسے الہامی ہی سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ میں تصور تک نہیں کرسکتا کہ اتنی بڑی آیت کائنات پٹینٹ آفس کے ایک کلرک پر اثر کرسکتی ہے۔ اور وہ بھی ایک جونیئر کلرک پر تمہارا چہیتا اسٹیفن ہاکنگ، جسے تم ایک طبیعات دان سمجھ رہے ہو، بنیادی طور پر مابعد الطبیعات کا آدمی ہے، اس کی بلیک ہول تھیوری اس وقت تک طبیعات کا حصہ نہیں سکتی جب تک وہ عملی طور پر ثابت نہیں ہو جاتی۔ (۱۴)

عرفان کا خیال ہے کہ نفسیات کے میدان میں بہت کم کام ہوا ہے۔ سائنس نے اگرچہ طبیعات کی میدان میں بہت ساری ترقی کی لیکن نفسیات کے میدان میں کسی نے ژونگ، فرائنڈا اور اڈلر کے کام کو آگے نہیں بڑھایا۔ عرفان کہتے ہیں:

> سائنس نے اب تک جو ترقی کی ہے وہ طبیعات میں کی۔ نفسیات کا شعبہ ابھی بہت پیچھے ہے۔ بہت سے لوگوں نے آئن سٹائن کے کام کو آگے بڑھایا ہے۔ لیکن فرائیڈ، ژونگ اور اڈلر کا ابھی تک کوئی قابل ذکر جانشین پیدا نہیں ہوا۔ ہم کائنات کے بارے میں تو بہت کچھ جانتے ہیں، مگر اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتے، ہم یہ تو بتا سکتے ہیں کہ آئندہ صدی میں پہلا سورج گرہن کس سن کے کون سے دن، کتنے بجے ہوگا۔ مگر یہ نہیں جان سکتے کہ ہماری محبوبہ، جسے ہم پوری طرح سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، ہمارے سامنے بیٹھی کیا سوچ رہی ہے۔ (۱۵)

عرفان آنند کے اس خیال سے مختلف ہے کہ ہر آدمی کا اپنا سچ ہے جس کو پانے کے لیے وہ ایک علم کا انتخاب کرتا ہے۔ لیکن فساد کی وجہ یہ ہے کہ ایک انسان اپنے پانے والے سچ کو حتمی تصور کرتا ہے۔

> ہر آدمی کا اپنا سچ ہے جسے پانے کے لیے وہ ان میں سے کسی ایک علم کا انتخاب کرتا

ہے۔لیکن فساد وہاں سے شروع ہوتا ہے۔ جب ہر آدمی اپنے سچ کو دوسروں پر تھوپنے کی کوشش کرتا ہے۔ دیکھو میں ، میں ہوں اور تم ،تم، ہم دونوں کا اپنا اپنا سچ ہے۔ جب میری کیمسٹری تم سے مختلف ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ میرا سچ تمہار سچ بھی ہو، سچ ایک ہاتھی کی مانند ہے، اور اس کے متلاشی اندھے جس کا ہاتھ اس ہاتھی کے جس حصے پر پڑتا ہے وہ اسی کو سچ سمجھ لیتا ہے کوئی سمجھتا ہے کہ سچ ہاتھی کی اگلی ٹانگوں کی طرح ہے، کسی کی نزدیک اس کی پونچھ کی طرح اور کوئی اس کی سونڈ کو اپنا سچ سمجھ لیتا ہے۔ حالاں کہ یہ سارے سچ مل کر کائناتی سچ تشکیل دیتے ہیں۔ مجھے یہ حق تو ضرور ہے کہ اپنا سچ تم سے شیئر کروں مگر مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں اپنا سچ تم پر مسلط کروں۔(١٦)

اختر رضا سلیمی اپنے ناول میں ان دو حیران کن واقعات کا ذکر کرتا ہے ۔جس کی پیشن گوئی پہلی کی ناولوں کی صورت میں ہو چکی تھی۔سلیمی کا خیال ہے کہ ہمارا ہر عمل معروض پر اثر انداز ہوتا ہے۔اس کی بڑی مثال ١٨٩٨ء میں چھپنے والا ناول ٹائی ٹینک کی تباہی ہے۔اس ناول کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کا سب سے طاقتور ترین اور محفوظ ترین جہاز اپنے حفاظتی کشتیوں کے ساتھ بحراوقیانوس میں رواں دواں ہے۔ جہاز کے مالک کا دعویٰ کہ خدا بھی اس جہاز کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ۔ دوران سفر جب سارے لوگ نہایت اطمینان سے اندر خوش گپیوں میں مصروف ہیں اچانک جہاز ایک برفانی تودے سے ٹکراتا ہے جس میں پچیس سولوگ ہلاک ہوتے ہیں۔

ٹھیک ١٤ سال بعد ٹائی ٹینک کی تباہی کا واقعہ بالکل اسی طرح پیش آیا۔جس طرح ناول نگار مارگان رابرٹ سن نے ناول میں پیش کیا تھا۔ ناول کے واقعات اور حقیقی واقعات میں ایک عجیب وغریب مماثلت پایا جاتا ہے۔ ناول نگار نے اپریل کے جس رات کا ذکر کیا تھا۔ اس رات یہ جہاز تباہ ہوا جس سمندر کا ذکر کیا تھا یعنی بحراوقیانوس اسی میں یہ واقع پیش آیا۔جتنی کشتیاں حفاظتی کام کے لیے بتائی تھی ان کی تعداد بھی حیرت انگیز طور پر ایک جیسی تھی۔ دوسری اہم مثال ایک ناول چاند کا سفر نامے مشہور ناول کا ہے۔ یہ ناول ١٨٦٥ء میں لکھا گیا تھا۔ٹھیک ١٠٤ء سال بعد ١٩٦٩ء کو سب کچھ اس ناول کے مطابق ہوا۔یعنی ١٩٦٩ء میں پہلی بار انسان نے چاند پر قدم رکھا۔ ناول میں جس طرح انسان کو دکھایا گیا ہے کہ وہ کسی طرح چاند کے سفر پر جاتا ہے بالکل اسی طرح ہوا یعنی دونوں میں اتنی مماثلتیں پائی جاتے ہیں کہ انسان کو یقین کرنا

پڑتا ہے۔ ان واقعات کو بیان کر کے اختر رضا سلیمی ناول میں یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ انسانی ذہن کتنا حیران کن تخلیق ہے۔

۲۰۰۵ء کے زلزلے میں جب زمان غار کے اندر چھوٹ لگنے سے کومے میں چلا جاتا ہے۔ اور وہ جینیاتی طور پر ڈھائی ہزار سال پیچھے سفر کرتا ہے اس منظر کو اختر رضا سلیمی نے بڑے خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے۔ اس ناول کے ہر صفحے پر ایک مبہوت کر دینے والا طلسمی ماحول ہے جو قاری کو اپنے گرفت میں رکھتا ہے۔ کومے کے بعد جب زمان ہوش میں آتا ہے، تو وہ بڑے مشکل میں ہوتا ہے۔ وہ کسی کو پہچانتے نہیں حتیٰ کہ سب سے قریبی رشتے ماں کو بھی نہیں پہچانتے۔ ان کا ماضی وہ خواب بن جاتا ہے جس میں وہ ڈھائی ہزار سال پیچھے گیا تھا۔اور اشوک اعظم کے حکم پر چٹانوں پر کلمات تراشے تھے۔ اس سے پہلے وہ سید احمد شہید کے ساتھ تھا۔ اور میدان جنگ میں سکھوں کے خلاف لڑ رہا تھا۔ ناول کے اس عجیب وغریب اور طلسمی ماحول کے حوالے سے ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

> قاری محسوس کرتا ہے کہ ایک طلسمی ماحول ابتدا سے انتہا تک قصے پر چھایا ہوا ہے۔ مارگلہ کی پہاڑیوں کے پیچھے تاریخی مقامات پر مبنی لوکیل وقت کے رہوار پر سوار ایسی ہمالیاتی شخصیات کو اپنے جلو میں لیے محوسفر ہے جو طبیعات کے مقابلے میں مابعد الطبیعات کی دور بین سے ان مناظر کو آئینہ کرتا ہے۔ جنہیں تخلیقی قوت سے ہمکنار ذہین شاعر اختر رضا سلیمی نے ابہام سے پاک صاف و شفاف زبان و بیان کی مدد سے ہر طبقے کے قاری پر اس طرح عیاں کر دیا ہے۔ کہ انہیں اپنی روح میں اترتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ جاگے ہیں خواب میں کو اردو ناول کی دنیا میں مرزا ہادی رسوا سے لے کر، عزیز احمد، قرۃ العین حیدر اور مرزا اطہر بیگ تک کے ارتقائی سفر میں ایک علیحدہ شناخت کے حامل ناول کی حیثیت سے یاد رکھے جانے کا قطعی امکان موجود ہے۔(۱۷)

دنیا بھر کی زبانوں میں جتنے بھی کامیاب ناول ہیں۔ ان ناولوں کی کامیابی کے دیگر وجوہات بھی ہیں جیسے موضوع کتنا بڑا ہے کہ پلاٹ کیسا ہے؟ کردار جاندار ہے یا نہیں لیکن ایک وجہ کامیاب ناول کی یہ ہے کہ اس ناول کا آغاز کیسا ہوا ہے؟ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ناول موضوع کے لحاظ بہت بڑا ہوتا ہے اور

ناول میں بڑے بڑے فکری مباحث ہو چکے ہوتے ہیں، لیکن ناول کا آغاز کچھ اس طرح ہوتا ہے جو زیادہ دل چسپ اور قاری کو شروع سے اپنے گرفت میں لے لیتا ہے اور پھر قاری کی دل چسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔ اگر ہم اردو ادب میں ابھی تک کامیاب ناولوں کا مطالعہ کریں تو ان ناولوں کی کامیابی میں آغاز و انجام نے بڑا کردار ادا کیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا ناول آگ کــا دریـــا ہو، عبداللہ حسین کا ناول اداس نسـلیں ہوں یا پھر کرشن چندر کا ناول شـکسـت ہوں یہ تخلیق کار ناول کا آغاز ہی کچھ اس رح کرتے ہیں کہ قاری کو شروع سے تجسس کی لت پڑتی ہے اور پھر وہ کسی بھی طرح ناول کو ختم کرنے سے پہلے نہیں چھوڑتا ایک تخلیق کار کے لیے جس طرح ایک ناول کا آغاز مشکل ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح کہانی کو انجام تک پہچانا اور ناول کا خاتمہ کامیابی سے کرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ جو تخلیق کار اس میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ان کے ناول ادبی میدان میں شہرت پاتے ہیں اور وہ ناول ہمیشہ کی زندگی پاتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے کامیاب ناولوں کی طرح اپنے ناول کا آغاز کچھ اس شاندار انداز سے کیا ہے کہ شروع ہی قاری اس کے طلسمی ماحول میں محو ہوتا ہے۔ سلیمی صاحب نے ناول کا آغاز کچھ یوں کیا ہے۔

> یہ سب خواب سا ہے بالکل خواب سا زمان نے پتھریلے تکیے پر سر رکھ کر خلا میں گھورتے ہوئے سوچا۔ گذشتہ کئی سال سے اس کا معمول تھا کہ وہ مہینے میں دو چار دن اور ایک آدھ چاندنی رات یہاں ضرور گزارتا۔ دن کے وقت اس کی نظریں نشیب میں بسنے والی بستی پر جب رات کو آسمان پر مرکوز رہتیں۔ وہ جب بھی یہاں آتا ، ہمیشہ اسی مقام پر بیٹھتا۔ یہ ایک غار کے دہانے کا پتھریلا چبوترا تھا۔ جس کی لمبائی سات فٹ اور چوڑائی چار فٹ کے قریب تھی۔ پتھریلا ہونے کے باعث نہ تو اس پر گھاس واس اور جڑی بوٹیاں اُگتیں اور نہ ہی مٹی اوردھول جمتی، اگر کبھی کبھار دھول پڑتی تو بھی اسے آسانی سے صاف کیا جاسکتا تھا۔ البتہ خشک پتے اس پر عموماً سرسراتے رہتے۔ جن کے سرگوشوں سے وہ بہت مانوس ہو چکا تھا۔(۱۸)

ناول کے آغاز کے حوالے سے محمد شعیب لکھتے ہیں:

> بہترین اور منفرد مرکزی خیال کے باوجود ناول کا غیر مناسب آغاز آگے آنے والے تمام واقعات کو بے ہنگم بنا سکتا ہے جس سے ناول میں دلچسپی ختم ہو کر رہ جاتی ہے

> اور اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے لیکن اس ناول میں ۔۔۔۔ جملہ ہی بڑا جان دار ملتا ہے اور ایجاز و اختصار کے باوجود اس میں جہان معنیٰ کا دریاں پنہاں ہیں اسے سلیمی کی کامیابی کہا جاسکتا ہے۔(۱۹)

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ یہ ناول موضوعات ،نظریات او رمشاہدات کے حوالے سے اردو کے دوسرے ناولوں سے ہٹ کر لکھا گیا ہے۔ اور اس ناول نے اردو ادب کو ایک خوبصورت روایت سے روشناس کرایا ہے۔ کبھی مارگلہ اور ٹیکسلا کے آثار قدیمہ سے گندھارا تہذیب کے چشمے پھوٹنے لگتے ہیں تو کہیں مری اور ہزارہ ، بالخصوص بالاکوٹ کی پہاڑی چوٹیاں اپنی داستانیں کہنے لگتی ہیں۔ ناول میں کیسے کہانی لکھی جائے، اس حوالے سے سہیل بخاری کی درج ذیل اقتباس قابل توجہ ہے۔

> ''ناول میں عام طور سے وہی زندگیاں پیش کی جاتی ہیں، جن میں مدو جزر، عروج و زوال اور اتار چڑھاؤ ملتا ہے دل کشی کا سامان تو ایسی ہی زندگی میں ملتا ہے جس میں خارجی حالات اور داخلی کیفیات کی ایک مسلسل کش مکش اور آویزش پائی جاتی ہے۔ چناں چہ ناول اپنے سفر میں کتنے ہی منازل سے گزرتا ہے۔ متعدد مقامات پر اس میں مختلف تحریکات کے زیر اثر واقعاتی تنوع پیدا کیا جاتا ہے تا کہ قاری کے ذہین میں سکون، اضطراب ،تجسس، حیرت ،مسرت اورغم وغیرہ کے مختلف پیدا ہوتے ہیں اور آئندہ واقعات معلوم کرنے کی فکر میں برابر لگا رہے۔(۲۰)

اختر رضا سلیمی نے اس ناول کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے جن کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ ایک خواب: جو حقیقت میں بھی موجود تھا

۲۔ خواب کا پس منظر

۳۔ خواب کا پیش منظر

۴۔ ایک خواب: جو خواب نہیں تھا

۵۔ خواب درخواب

۶۔ ہیں خواب میں ہنوز

۷۔ خواب اور حقیقت کے درمیان

۸۔ جاگے ہیں خواب میں

ابواب بندی کو دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ اختر رضا سلیمی نے ہر باب کے نام میں خواب کا ذکر کیا ہے جو بڑا معنی خیز ہے۔ ناول کے ابواب بندی کے حوالے سے محمد شعیب لکھتے ہیں۔ ان عنوانات نے ناول کے پلاٹ میں ایک خاص ترتیب و تہذیب کو جنم دیا ہے اور خواب تو ویسے بھی ایک طلسماتی کیفیت کا نام ہے، خواب او اس کے متعلقات کے موضوع کو اردو ادب میں اتنا زیادہ استعمال کیا گیا ہے کہ اب یہ اجنبی نہیں ہے۔

اختر رضا سلیمی کے اس ناول کا اگر ہم مرکزی خیال بیان کرنا چاہے تو وہ یہ ہے کہ اس ناول میں سلیمی دراصل اس جینٹکس مسائل کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں جس میں نسل کے اثرات دوسرے نسل پر پڑتے ہیں۔ مثلاً زمان جو اس ناول کا مرکزی کردار ہے وہ اپنے دادا ظفر علی خان کی طرح تنہا پسند اور عجیب وغریب عادات کا مالک ہے۔ اس ناول میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ جینیاتی خصوصیات نسلوں میں گردش کرتی رہتی ہیں۔ اختر رضا سلیمی کے اس ناول کو لکھنے کے لیے جو چیز محرک بنی وہ اسی طرح کا ایک حیران کن واقع تھا وہ لکھتے ہیں:

> دس سال قبل ایک شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے میرا مری جانا ہوا وہاں ایک پہاڑی چشمے سے جب میں پانی پینے کے لیے اترا تو یکا یک مجھے احساس ہوا جیسے میں پہلے بھی یہاں آچکا ہوں اور ایک عرصہ یہاں گزار چکا ہوں۔ حالاں کہ میں زندگی میں کبھی اس علاقے میں نہیں آیا تھا۔ اس کے بعد یہ واقع مجھے کواب میں بار بار دکھائی دینے لگا۔ شاعر ہونے کے ناطے اس پر نظم لکھنے کی کوشش کی پھر احساس ہوا کہ ایک نظم سے بات نہیں بنے گی۔ جب میں نے اس بارے میں مطالعہ شروع کیا۔ تو جینیاتی یادوں کے ورثے کی منتقلی کے عمل نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ اور یوں ناول کا بیج بویا گیا۔ (۲۱)

نفسیات کا ایک شعبہ ایسا بھی ہے جس میں ایک نسل کے ساتھ پیش آمدہ واقعات کا دوسری نسل پر اثرات کا مطالعہ کیا جاتا ہے نفسیات کے اس شاخ کو Behavioral Genetics کہا جاتا ہے۔ قاسم یعقوب اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> نفسیات کی ایک اصطلاح ہے ''ڈی یاوو'' Dejavu ایک فرانسیسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں پہلے سے دیکھی ہوئی چیز، یعنی کسی منظر یا عمل کو دیکھتے یا کرتے ہوئے یہ گمان کرنا کہ یہ منظر یا عمل اس کے تجربے سے پہلے ہی گزر چکا ہے۔ کیا ایسا صرف ذاتی تجربے کی بنیاد پر ہوتا ہے یا کوئی ان دیکھے واقعات بھی اس شخص یا شخصیت میں جینیاتی طور پر شامل ہوتے ہیں! اختر رضا سلیمی کے ناول جاگے ہیں خواب میں میں اسی ایک نفسیاتی کیفیت کو مرکزی تھیم بنایا گیا۔ نفسیات کی ایک شاخ Behavioral Genetics بھی جس میں جینیاتی طور پر ایک نسل کے واقعات کا دوسری نسل پر اثرات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اختر نے Behavioral Genestics کو پہلی دفعہ ایک ایسی کہانی میں آشکار کیا ہے جو جیتی جاگتی اور ہر آدمی کی اپنی کہانی ہے۔(۲۲)

لاشعور ایک ایسا سمندر ہے جس کے کوئی حدود نہیں ہے۔ لاشعور کی دریافت میں بڑا کردار ڈاکٹر سگمنڈ فرائیڈ کا ہے۔ محمد سلیم الرحمان لکھتے ہیں:

> جب نفسیات دانوں نے لاشعور کے اصطلاح کو فروغ دیا تو ذہن کی سنجیدگی میں اضافہ ہوگیا۔ شعور کا کوئی کرانہ تھا نہ اس کی گنجائشوں کی کوئی حد، جس طرح کائنات کے بارے میں کچھ علم نہیں کہ کہاں تک پھیلی ہوتی ہے اسی طرح لاشعور کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ شعور اور لاشعور دو اقلمیں ہیں، جن میں آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں۔ اس تموج کی جھلک ادب اور علم وفنون میں نظر آجاتی ہے۔ اس سے زیادہ ہم نہیں جانتے۔(۲۳)

مشہور نفسیات دان ژونک نے لاشعور میں دوئی تلاش کر لی۔ اس کا کہنا ہے کہ لاشعور کے دو اقسام ہوتے ہیں ایک انفرادی لاشعور ہوتا ہے اور ایک اجتماعی لاشعور ہوتا ہے، اجتماعی لاشعور میں انسانوں کے تمام

تجربات ، خواہشات، آرزوئے خوابیں اور امنگیں جمع ہیں۔ اجتماعی لاشعور کی جھلک کبھی کبھار ادب اور علوم و فنون میں نظر آتی ہے۔ اختر رضا سلیمی کے اس ناول پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کے لاشعور میں صرف چند واقعات کیوں پیش آئے۔ جیسے دادا ظفر علی خان کا واقع ان کے ساتھ کومے میں ہوتا ہے یا پھر وہ نور خان کے روپ سید احمد بریلوی کے ساتھ میدان جنگ میں لڑ رہا ہوتا ہے یا اشوک اعظم کے حکم پر چٹانوں پر عبارات کندہ کرا رہے ہیں۔ اس سوال کے جواب میں محمد سلیم الرحمان لکھتے ہیں۔

> یہ اعتراض شاید کیا جائے کہ زمان کے لاشعور سے صرف سید احمد شہید اور اشوک کی یادیں ابھر کر کیوں سامنے آتیں! کیا پچھلے دو ہزار سال میں اس کے آباو اجداد کے اجتماعی لاشعور میں اور واقعات محفوظ نہ تھے۔ اس کا ایک جواب یہ ہوسکتا ہے کہ زمان کے خاندان کی طویل تاریخ میں یہی دو واقعات سب سے روشن ہوں گے۔(۲۴)

اختر رضا سلیمی نے اپنے ناول کی بنیاد نفسیاتی کیفیت پر رکھی ہے۔ کہ انسان کبھی کبھی ایک منظر کو دیکھتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ منظر میں پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں حالاں کہ ایسا نہیں ہوتا اور اس کے علاوہ وہ جینیاتی رویہ اور خصوصیات ہوتے ہیں جو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ قاسم یعقوب لکھتے ہیں۔

> نفسیات کا میدان بہت بڑا ہے۔ ناول نگار نے انسانی لاشعور کی گرہیں انسانی شعور سے الگ اس کے جینیاتی ورثے کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ یہ شاید کسی ناول کا پہلا موضوع ہے کہ نسل در نسل کسی بھی عمل کی شدت یا کوئی ان جانی کیفیت اپنا آپ آشکار کرتا رہتی ہے۔(۲۵)

ڈاکٹر وحید احمد اس ناول کے حوالے سے لکھتے ہیں؛

> ناول میں ایک اہم موڑ زمان کا Cerebral Edema ہے۔ جس سے پیدا ہونے والی Hallu Cinations ذہن کے کون مکانی عمل میں ہلچل پیدا کرتی ہیں۔ ایک مابعد الطبیعاتی تبدیلی اسے Time machine میں بٹھاتی ہے۔ لاشعور ،تحت شعور اور شعور کے درمیان حائل پردے اٹھ جاتے ہیں۔ وہ اس قابل ہو جاتا

ہے کہ چٹان پر کندہ مہا راجہ اشوک کے فرمان پڑھ لے۔ جو خروشی رسم الخط میں لکھے گئے ہیں۔ ناول کی ایک خوبصورتی یہ ہے کہ یہ روایت سے ہٹ کر لکھا گیا ہے طبیعات اور مابعد الطبیعات کی سلوں کو شاعرانہ پلستر سے جوڑ کر کہانی کی عمارت اٹھائی گئی ہے۔ جس کے دریچوں میں گزرا ہوا وقت پردے ہلاتا ہے اور جس کے شیشوں سے نگار آئندہ کا ہیولا نظر آتا ہے۔(۲۶)

ڈاکٹر وحید احمد شعور لاشعور اور تحت شعور کے حوالے سے آگے لکھتے ہیں:

The Interpretation of Dreams سگمنڈ فرائڈ کا شاہکار ہے وہ لاشعور اور الشعور تال میل سے خوابوں کی شعوری تشریح کرتا ہے۔ مگر یہ نظریہ اتنا نازک اور پیچیدہ ہے کہ فرائڈ نے کم از کم آٹھ مرتبہ اس کتاب میں ترمیم کیں ہیں۔ اور ایک دقیق نظر ثانی کے بعد اشاعت کی۔ وہ بیرو کیئر ،ژونک اور اڈلر کے برعکس حیاتیاتی خواہشات کو خوابوں کی وجہ بتاتا ہے وہ خوابوں کو خواہشات کی تکمیل کا نام دیتا ہے اور انہیں لاشعور کی شاہراہ قرار دیتا ہے۔ شاعری میں یہ سہولت ہے کہ وہ طبیعات مابعد الطبیعات ، زمان ومکان اور خوابوں کو وجدان کے چاک پر رکھ کر کوزی گری کرتی ہے۔(۲۷)

اس ناول کا اہم ترین حصہ وہ ہے جب ڈاکٹر صدیقی زمان کے والدعزیز خان کو زمان کا اصل مسئلہ سمجھاتا ہے۔

میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ جب وہ کومے میں گیا تو اس کا لاشعور جاگ گیا اور اس نے ایک طویل خواب دیکھا۔ گویا یہ عام سی بات ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اب یہی خواب اس کا ماضی ہے۔ ہمارے نقطہ نظر سے وہ بے ہوش ہوگیا تھا اور اب بظاہر ہوش میں آگیا ہے۔(۲۸)

ڈاکٹر فاروقی عزیز خان کو وہ اصل مسئلہ سمجھانے میں کس طرح ایک ترتیب سے زمان نے ماضی کا سفر کیا۔

> اس کے ذہن میں واقعات کی ترتیب بالکل الٹی ہے۔ وہ ماضی میں ایک خاص ترتیب سے پیچھے گیا ہے جو منظر اس نے سب سے پہلے دیکھا وہ اس کا ماضی بعید اور جو سب سے آخر میں دیکھا وہ ماضی قریب ہے۔ وہ کوشش کے باوجود اس منظر کو اپنے ذہن میں نہیں لا پایا جو اس نے سب سے پہلے دیکھا تھا، اگر ہم کسی طرح اسے وہ منظر یاد دلانے میں کامیاب ہو جائے تو ممکن ہے اس کی یادداشت لوٹ آئے۔(۲۹)

یہی وہ نکتہ ہے جس پر پورے ناول کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ انسان کا شعور محض اس کا بنایا ہوا نہیں اور نہ ہی وہ اجتماعی لاشعور کا ایک حصہ ہے۔ بلکہ اس میں جینیاتی کار فرمایہ بھی ہوتی ہے۔ اختر رضا سلیمی نے ناول میں یہ تھیوری ۲۴۱ صفحوں میں بیان کی ہے۔ وہ جگہ جہاں اختر رضا سلیمی پہلی بار گئے اور اس کو محسوس ہوا کہ میں پہلے بھی یہاں آچکا ہوں حالاں کہ وہ گیا نہیں تھا۔ جس پر اس نے ایک ناول لکھنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ان کے شعری مجموعے خـــواب دان میں بھی ایک ایسی نظم ہے جو اس ناول کے پورے تھیم کو بڑی خوبصورتی سے بیان کرتی ہے۔ اختر رضا سلیمی کی وہ نظم میں یہاں نقل کر رہا ہوں۔نظم کا نام دائرہ ہے۔

میں پہلی بار اگرچہ یہاں پہ آیا ہوں
ہر ایک چیز مگر دیکھی بھالی لگتی ہے
سبھی نظارے یہاں کے ہیں آشنا مجھ سے
یہ جانتے ہیں مرے بارے، سوا مجھ سے
میں پہلی بار اگرچہ یہاں پہ آیا ہوں
یہ جھرنا پانی کا جو بہہ رہا ہے تیزی سے
ہے آشنا مری آنکھوں کی خواب ریزی سے
گل آج دیکھ کے مجھ کو یہاں یوں کھل رہے ہیں
کہ جیسے قدموں کے بعد دوست مل رہے ہیں
گیاہ سبز بچھی جا رہی ہے پاؤں میں

بلا رہے ہیں مجھے پیڑ اپنی چھاؤں میں
میں پہلی بار اگرچہ یہاں پہ آیا ہوں
یہ دل فریب خموشی، سکون، تنہائی
فریضہ ہے دل و جاں سے جن پر رعنائی
سنا رہے ہیں مجھے نغمہ شناسائی
میں پہلی بار اگرچہ یہاں پہ آیا ہوں
میں پہلی بار یہاں آیا ہو تو ممکن ہے
کہ مجھ سے پہلے مرے رفتگان میں سے کوئی
یہاں پہ آکے رکا ہو برائے نظارا
اور اس نے اتنی توجہ سے ان کو دیکھا ہو
کہ آج مجھ کو بھی دیکھے ہوئے سے لگتے ہیں
یہ کیا بعید کل آئندگان میں سے کوئی
یہاں پہ آتے تو جائے یہ گنگناتے ہوئے
میں پہلی بار اگرچہ یہاں پہ آیا ہوں
ہر ایک چیز مگر دیکھی بھالی لگتی ہے (۳۰)

ادب ایک ایسا میدان ہے۔ جہاں ادیب انسانی زندگی کے وہ کڑیاں، واقعات، تخیلات اور مظاہر جو علمی اور شعور سطح پر گرفت میں نہیں لیے جاسکتے تو پھر یہ کام ادیب کرتا ہے جس میں وہ کچھ انکشافات بھی کرتا ہے اور بعض اوقات وہ مستقبل میں سچ بھی ثابت ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صلاح الدین درویش بھی سلیمی صاحب کے اس ناول کو بھی ایسا ہی ایک تخلیقی قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

> اختر رضا سلیمی کا ناول ''جاگے ہیں خواب میں'' دراصل فطرت اور نفس انسانی میں موجود حیرتوں کو معنوی اعتبار سے مربوط بنانے کی ایک کوشش ہے۔ حیرت ذہن

> انسانی کا ایسا مختصر یا طویل وقفہ ہوتا ہے کہ جس کی موضوع تجسیم خواہ وہ شعوری ہو یا تخیلاتی، نہیں ہو پاتی۔ وقوعات یا مظاہر کے درمیان بے شمار کڑیاں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کی ساخت، ماہیت، اسلوب اور رنگوں سے انسانی ذہن آشنا نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی ایسے مناسب و موزوں الفاظ ہوتے ہیں۔ کہ جن کے ذریعے کسی حیرت کسی خاص بیانیے کی صورت دی جا سکے۔ چناں چہ انسان کی علمی، فکری یا شعوری ذات حیرت کو جب گرفت میں لے لینے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ تو ادیب شاعر یا کوئی بھی فنکار چند ابہام سے معمور انکشافات کرتا ہے کہ جو کسی بھی نوع کی مقداری، وضعی، پیائش سے آزاد ہوتے ہیں۔ یہ دراصل واقعات اور مظاہر میں موجود نا آشنا کڑیوں میں ربطہ پیدا کرنے کا امکانی قیافے یا خیالیے ہوتے ہیں۔ ناول کے ہیرو ''زمان'' کے ذریعے اختر رضا سلیمی نے ایسے ہی امکانی خیالیے کو حیرت کی نشان دہی کے لیے تخلیق کیا ہے۔ یاد رہے کہ حیرت خود زمان کی نہیں ہے بلکہ حقیقی جہاں اور حیرت کے جہاں میں ربط پیدا کرنے کی کوشش اختر رضا سلیمی کا اپنا مسئلہ ہے۔(۳۱)

اختر رضا سلیمی اس ناول میں یہ ظاہر کر رہا ہے کہ انسانی ذہن میں یہ طاقت ہوسکتی ہے کہ وہ بیک وقت ماضی، حال اور مستقبل میں جی سکے اور ان کا ادراک لگا سکے۔ کیوں کہ ناول میں مرکزی کردار ''زمان'' اسی صلاحیت کا مالک ہے۔ ناول میں یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ انسان کے علاوہ جانور کو پیش آمدہ آفتوں کا پتا چلتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر صلاح الدین درویش لکھتے ہیں:

> ناول میں موجود حیرت سے متعلق گمان کے منطقی بیانیے کے دوسرے بڑے وقوع کا تعلق زمان کے اس ذہنی کیفیت کے ساتھ ہے کہ جس انسلاک، حال، ماضی اور ماضی بعید کے علاوہ مستقبل کے ساتھ بھی ہے۔ اختر رضا سلیمی کی نظر میں اگر کوئی جیتا جاگتا انسان حال میں رہتے ہوئے تاریخ میں مدفون زمانوں کا ایک کردار ہوسکتا ہے تو کیا عجب وہ آئندہ زمانے میں بھی ایک زندہ انسان کے طور پر زندگی بسر کر رہا ہو۔ کم از کم مستقبل قریب میں ہونے والے واقعات کی وہ درست نشان دہی ضرور کرسکتا ہے کیوں کہ وہ بطور انسان اپنے کردار کے باعث مستقبل میں بھی ''زندہ'' ہے۔

آنے والے طوفان یا زلزلے کا پتہ ہماری حکایات کے سبب اگر جانوروں کو پہلے ہی لگ جاتا ہے اور زمان کا دوست ''ڈبو'' بھی مستقبل قریب میں آنے والے سانحات سے لرزیدہ ہو جاتا ہے تو پھر زمان جو ایک انسان بھی ہے وہ مستقبل میں ہونے والے واقعات کو کیوں نہیں بھانپ سکتا؟ ڈبو کی طرح زمان بھی مستقبل قریب میں ہونے والے واقعات کی نشان دہی پر قادر ہو جاتا ہے۔(۳۲)

ناول سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان موت کے بعد مکمل فنا نہیں ہوتا بلکہ وہ دوسری جہاں میں منتقل ہوتا ہے۔ زمان کا جب انتقال ہوتا ہے تو اپنے لاش کو دیکھ رہا ہوتا ہے اور اس کی بیوی روتی رہتی ہے۔ اور جب اس کی ماں مرتی ہے تو زمان اس سارے ہنگامے کو دیکھتا ہے جب گھر کے لوگ غم کی وجہ سے رو رہے ہوتے ہیں۔

اختر رضا سلیمی کے اس ناول سے پہلے بھی ایسے ناول لکھے گئے ہیں جس میں کردار حال سے ماضی کی طرف کرتا ہے اور ماضی سے حال کی طرف لیکن اختر رضا سلیمی نے یہ کمال کیا ہے کہ ان کا مرکزی کردار زمان مستقبل میں بھی جھانک رہا ہے۔ ڈاکٹر صلاح الدین درویش لکھتے ہیں:

ناول کی کہانی کے اعتبار سے حال سے ماضی اور پھر ماضی سے حال کی طرف کرداروں کے سفر کو دکھانا اردو ناول میں بھی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اختر رضا سلیمی نے اسلوب کے اس وسیلے سے ایک اور کام لیا ہے کہ ایک ہی کردار بیک وقت ماضی حال اور مستقبل میں باقاعدہ زندہ اور متحرک دکھایا گیا ہے۔۔(۳۳)

مشہور اردو اخبار ایکسپریس میں غلام محی الدین نے ناول پر کچھ یوں تجزیہ کیا ہے۔

اختر رضا سلیمی کی شخصیت کی جانچ اور ایک ناول جاگے ہیں خواب میں سے ہوتی ہے۔ جو ان کا تازہ ناول ہے۔ اختر رضا سلیمی کا یہ ناول پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کسی قدر بھول بھلیوں سے گزر کر ادب میں قدم رکھا ہے۔ یہ ناول اسلام آباد کے عقب میں واقع مارگلہ کے پہاڑی سلسلے کے دوسری طرف بہنے والے دریائے ہرو کے آس پاس رہنے والوں کی زندگیوں کا احاطہ کرتا ہے۔ بظاہر تو یہ ناول

کا نمایاں رنگ آواگون یا تناسخ کا نظریہ ہے جس کے تحت ناول کا مرکزی کردار مختلف ادوار میں مختلف شناختوں سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اختر رضا سلیمی نے اپنے ناول کو جدید سائنسی بنیادوں پر استوار کیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار اشوک اعظم کے عہد سے لے کر انیسویں صدی انگریزوں کی عمل داری اور پھر وہاں سے ہوتا ہوا جدید زمانے تک سفر کرتا ہے یوں اس ناول کی حیثیت تاریخی بھی ہے۔ لیکن یہ اس تاریخ سے خاصی مختلف ہے جو ہماری روایتی کتابوں میں ملتی ہے۔(۳۴)

اختر رضا سلیمی کا یہ ناول اگرچہ اپنے نادر موضوعات کی وجہ سے شہرت پا چکا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس کی شہرت کی وجہ مسحور کن کر دینے والی منظر نگاری ہے۔ جس کو مختلف ناقدین سے سراہا ہے۔ قاسم یعقوب لکھتے ہیں؛

دریا ہرو صرف ایک دریا نہیں ناول میں ایک کردار کے طور پر جلوہ گر ہوتا ہے۔ جو صدیوں سے اپنی روانی میں بہتا، اس خطے کی کہانی پڑھ رہا ہے۔ اختر رضا سلیمی نے ایک دن رک کر اس کی کہانی سمجھنے کی کوشش کی دریائے ہرو کی کہانی جس طرح اس نظم میں باندھی گئی ہے سچ پوچھیے تو ناول کا زریں حصہ بن گئی۔(۳۵)

دریائے ہرو جو آمن و آشتی کی علامت ہے اور ہزاروں سالوں سے مانسہرہ کی سرزمین کو سیراب کرتا ہے اختر رضا سلیمی نے ایک نظم کے ذریعے دریائے ہرو کی خوبصورت منظر کشی کی ہے۔

میں ہرو ہوں

ہزاروں برس سے یونہی اپنی رو میں بہے جا رہا ہوں

مری اور گلیات کی چھاتیوں سے نکلتی ہوئی دودھیا آبشاریں مری ظرف کو آزماتی رہی ہیں

مگر میں نے اپنے کنارے پہاڑ ایستارہ رکھے

تا کہ چاہوں بھی، تو اپنے آپے سے باہر نہ ہو پاؤں میں

قسم ہے زمانے کی

میں نے کسی بھی زمانے میں اپنے کنارے پہ آباد گاؤں اجاڑے نہیں
سو مرے پانیوں میں لہو کا نہیں
سیب وشہوت وزیتوں وانجیر کا ذائقہ ہے
مرے ساحلوں پر دیوار اور چیڑ کی خوشبوئیں تیرتی ہیں
میں گنگا نہ جمنا نہ نیل وفرات
ایک گم نام دریا ہرو ہو ہرو
مقدس صحیفے مرے تزکرے سے تہی ہیں
کہ میں نے کسی بھی زمانے میں انسانی جانوں کا نذرانہ مانگا نہیں
داستانوں میں میرا حوالہ نہیں
کہ میں نے کسی سوہنی کو ڈبویا نہیں
اور تاریخ کی سب کتابیں میرے باب میں چپ
کہ میری روانی میں پن چکیوں کی حسین گونج ہے العطش الطش کی صدائیں نہیں
تشنگی پیتے ہونٹوں کی آہیں نہیں۔ (۳۶)

اختر رضا سلیمی کے ناول کی طلسمی ماحول کے بارے میں اسد محمد خان لکھتے ہیں۔

کہیں دریائے کنہار کے کنارے آباد، بالاکوٹ جیسا تاریخی شہر سانس لے رہا ہوتا ہے تو کہیں دریائے ہرو اور اس کی معاون ندیاں اپنی جولانی دکھاتی ہیں کہیں پہاڑ ہیں تو کہیں غار(۳۷)

اختر رضا سلیمی کے ناول میں جذیات نگاری کے ساتھ منظر کشی کچھ اس انداز سے کی گئی ہے۔ کہ قاری کا دل چاہتا ہے کہ میں خود جا کر ان علاقوں کی سیر کروں، اختر رضا سلیمی کے منظر نگاری اور پھر اس

میں جذبات نگاری کو دیکھ کر اس کے جمالیاتی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

چبوترے پر مغرب کی طرف رخ کر کے کھڑا ہوا جائے تو داہیں اور بائیں جنگلی اناروں کی جھار جھنکاڑ ، پاؤں کی سمت غار کا دہانہ، جس کے نشیب میں میل بھر کے فاصلے پر ایک بستی، اور پشت کی طرف بتدریج بلند ہوا پہاڑ ہے۔ جس کی چوٹی چیڑ کے درختوں سے ڈھکی ہوتی ہے۔ غار کے عقب میں عین اس جگہ پر ، جہاں سے ہموار زمین یک دم بلند ہونا شروع ہو جاتی ہے، چیڑ کا ایک درخت ڈار سے بچھڑے ہوئے پرندے کی طرح، تنہا کھڑا ہے۔ جس کا تنا اتنا موٹا ہے کہ اگر دو آدمی اس کے مددوتنے کے گرد ، آمنے سامنے بازو پھیلا کر اسے اپنے کلاؤں میں لینے کی کوشش کریں تو ان کے ہاتھوں کی انگلیاں بمشکل ہی ایک دوسرے کو مس کر سکیں۔(۳۸)

اختر رضا سلیمی کے اس ناول میں بالاکوٹ کے پہاڑوں کے صاف و شفاف چشموں کا ذکر ہے تو اس کے ساتھ وہاں کے پہاڑوں میں جو درخت اور میوہ جات ہیں ان کا ذکر بھی ناول میں جگہ جگہ موجود ہیں لکھتے ہیں:

جنگلی اناروں کا ایک گھنا جنگل تھا اور اس کے درمیان ایک چشمہ بہہ رہا تھا جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی ۔ چشمے کے آگے ایک وسیع میدان تھا اور میدان کے آخری سرے پر ایک دیوقامت چٹان، چشمے کا پانی میدان کے بخوبی کنارے پر ایک نالے سے ہوتا ہوا چٹان کے قریب ایک آبشار کے صورت میں نیچے گر رہا تھا۔ میدان سے آگے کی نشیبی زمین اگر چہ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر مشتمل تھی لیکن زیادہ ڈھلوانی نہیں تھی۔ ٹیلے کسی حد تک پتھریلے مگر ان کے ساتھ کی زمین خاصی ذرخیز تھی۔ جہاں جنگلی اناروں کے ساتھ ساتھ کالے املوک، توت، بٹنگ، ناخ اور دوسرے پھل دار پیڑ تھے، جن میں سے بیشتر کے ساتھ لاکھوں (جنگلی انگور) کی بیلیں لپٹی ہوتیں تھیں، جن میں سے صرف اناروں اور املوکوں کے ساتھ اکا دکا پھل لٹک رہے تھے باقی تمام کے نیچے ان کے پک کر گرے ہوئے پھلوں کی باقیات تھیں۔(۳۹)

پہاڑوں میں جب کوئی درخت کاٹتا ہے تو اس کے کلہاڑی کے ایک ایک وار سے ایک عجیب قسم کی

آواز پہاڑوں میں پیدا ہوتی ہے۔ اختر رضا سلیمی نے اس منظر کو کچھ اس طرح پیش کیا ہے۔

پھر اچانک ہماری وادی، ٹھک، ٹھک، ٹھک کی زور دار آوازوں سے گونجنے لگی۔ یہ آوازیں غار کے آگے واقع گھنے جھنڈ میں سے آ رہی تھیں۔ پھر ان آوازوں کے ساتھ ہا اہ ہااہہ۔ ہااااہ کی آوازیں بھی شامل ہوگئیں رفتہ رفتہ یہ دونوں آوازیں بالکل ایک ہوگئیں۔ ان آوازوں کے عین عروج کے وقت تڑ تڑ تڑ کی ایک اور زور دار آواز پیدا ہوتی ہیں جس میں گڑگڑاہٹ بھی شامل تھی۔ اور پھر کان پھاڑ دینے والے ایک دھماکے کے ساتھ ایک بہت بڑا کاہو، کا درخت دھڑم سے زمین پر آ گرا۔ جس نے ہزاروں سال پرانے اس غار پر تین ساڑھے تین سو سال مسلسل سایہ کیے رکھا تھا۔(۴۰)

پانی، آبشاروں، اندیوں اور جنگلی میوہ جات اور درختوں نے اس ناول کے فضا کو سحر انگیز بنا رہا ہے۔

تقریباً بیس منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد وہ ایک چھوٹی سی ندی میں جا اترے ، جو اگرچہ تنگ تھی مگر ان کے رگوں میں دوڑتے ہوئے گرم خون کی طرح انتہائی جوش سے بہ رہی تھی۔ پانی اوپر ڈھلان کی طرف سے ایک فٹ بھر چوڑے اور تقریباً اتنے ہی گہرے کھتے میں انتہائی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ کچھ آگے جا کر پانی، ساڑھے چار گز بلندی سے نیچے ایک چھوٹی سے جھیل میں گر رہا تھا۔ جہاں آ کر اس کی سطح برابر اور بہاؤ سست ہو جاتا۔ ندی کے دونوں اطراف خوبانی، ناشپاتی، سیب، آلوچے، آڑو اور املوک کے درخت بے ترتیبی سے لگے ہوئے تھے۔ جن میں سے زیادہ تر کی ٹہنیاں پھلوں کی بوجھ سے ندی پر جھکی ہوئی تھی۔ املوک ابھی بالکل کچے تھے جب کہ باقی تمام درختوں کے بیشتر پھل تقریباً پک چکے تھے۔(۴۱)

پورے علاقے نے جب برف کی چادر اوڑھی تھی رات کے سمے جب چودھویں کا چاند نکل آیا تو وہ منظر کیسی تھی اختر رضا سلیمی لکھتے ہیں۔

عرفان احمد رات دس بجے کے قریب برف سے ڈھکی بستی میں داخل ہوا۔ تو سورج

> غروب ہوتے پانچ گھنٹے گذر چکے تھے۔ چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے روشن تھا اور چاندنی برف سے منعکس ہو کر ایک ایسا سماں تشکیل دی تھی جو نہ تو دن سے مشابہ تھی اور نہ ہی رات سے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسا چاند اپنے مدار سے ہٹ کر زمین کے بہت قریب آ گیا ہے۔ بادلوں کے چھٹ جانے کی وجہ سے برف پر کہرے کی وہ تہہ جمنا شروع ہو چکی تھی جو نہ صرف برف کو سخت کر دیتی ہے بلکہ سردی کی شدت میں اضافہ کر دیتی ہے۔(۴۲)

اختر رضا سلیمی کے کامیاب ناول کے پیچھے ان کا زبردست جمالیاتی ذوق کارفرماں ہے کہ وہ فطرت کا وہ مصور ہے جس کا اس زمانے میں کوئی ثانی نہیں ہے۔ کسی بھی تخلیق کی کامیابی کی اہم وجہ تخلیق کار کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ قاسم یعقوب لکھتے ہیں:

> اختر رضا سلیمی نے مشاہدہ بینی کے کمال جوہر پارے اکٹھے کر دیے ہیں۔ جب بارش ہوتی ہے۔ اور فقیر محمد خان گھر کے ملبے سے باہر نکالا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ منظر واقع میں آنکھوں کے سامنے کھلا ہوا ہے۔(۴۳)

زمان جس غار میں جاتا تھا اور پھر زلزلے کے دوران وہ چوٹ لگنے کی وجہ سے اسی غار میں کومے میں چلا گیا تھا۔ اسی غار کی منظر کشی اختر رضا سلیمی پوری جذیات کے ساتھ یوں کرتی ہے۔

> زمان مغرب کی سمت ایک چھوٹی پہاڑی پر کھڑے ہو کر اس پہاڑ کا نظارہ کرتا، جو اسے کسی اور دنیا میں لے جاتا وہ ٹک ٹکی لگا کر ادھر کو دیکھنے لگتا۔ دیکھتے دیکھتے غار اسے کسی حسینہ کے دہن کی مانند دکھاتی دینے لگتا۔ ایک ایسا دہن جس کا اوپر والا ہونٹ نسبتاً پتلا اور ابھرا ہوا ہو۔ غار کے دھانے پر پڑے ہوئے برف آلود پتھر، چاندنی میں اسے، حسینہ کے دانت معلوم ہوتے، برف میں لپٹے ہوئے اس منظر میں اس کا اپنا کمبل ، جسے وہ دانستہ وہاں چھوڑ آتا، اسے ایک سیاہ تل کے مانند دکھائی دیتا۔ جب کہ چیڑ کے تنے کو وہ ایک لمبی اور پتلی ناک ، مخالف اطراف میں پھیلے ہوئے اس کے نچلے ڈالوں کو آنکھیں، ان کے اوپر لٹکتی ہوئی دنبالہ دار شاخوں کو بھنوئیں اور اس سے پچھلے بڑے ٹیلے کو اس حسینہ کا سر تصور کرتا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ

> اپنی نظریں نیچے کی جانب لے جاتا۔ جہاں وادی میں موجود بڑی بڑی چٹانیں، اس کی آنکھوں کے آگے اس حسینہ کے سینے کے ابھاروں کی مانند ابھرتیں۔۔۔(۴۴)

اختر رضا سلیمی کو زمین کے زیور یعنی درختوں سے حد درجہ لگاؤ ہے۔ ان کے شاعری بھی ایک ایسی عالمی گاؤں کی شاعری ہے جس میں ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہے اور ان کے دونوں ناول جاگے ہیں خواب میں اور جندر میں درختوں کے ساتھ ان کی محبت اور درختوں کے بارے میں وسیع معلومات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> درختوں سے نکلنے والا مادہ جسے مقامی زبان میں ''جیکن'' کہا جاتا ہے۔ جس سے بستی کے خواتین ناپسندیدہ بالوں سے نجات حاصل کرتی تھیں۔(۴۵)

پرانے زمانے میں جب بجلی نہیں تھی تو لوگ چیڑ سے نکلنی والی دار مائع دار چیز کو پیالے میں ڈال کر ان سے مشعل جلاتے تھے۔

> ''چیڑ کی جیکن کو مٹی کے پیالے میں ڈال کر بطور مشعل جلاتے، چیڑ کے درختوں کا دھواں صحن میں موجود ڈینگی مچھروں اور مکھیوں کا یا تو مار گراتا یا پھر انہیں دور بھاگنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کمہار چیڑ کی چھال سے مٹی کے برتن پکاتے۔(۴۶)

فکشن ادب کی کسی بھی شکل میں ہو، اس کے اجزائے ترکیبی میں پلاٹ کا ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ پلاٹ کے بغیر ناول، پیچیدگیوں کی وجہ سے ناول نہیں کہلا سکتا۔ کامیاب ناول وہ ہے جس میں پلاٹ ڈھیلا ڈھالہ نہ ہو بلکہ اس میں ربط اور جڑت ہو۔ جاگے ہیں خواب میں ایک ایسا ناول ہے جس میں واقعات اور کردار وں میں ایسا ربطِ باہمی موجود ہے جس سے پلاٹ بڑا مربوط معلوم ہوتا ہے۔ محمد شعیب لکھتے ہیں:

> عام طور پر جن ناولوں میں معاشرت کی عکاسی کو برتا جاتا ہے، ان میں پلاٹ کی ترتیب ڈھیلی ڈھالی راہ اختیار کرتی چلی جاتی ہے اور واقعات کا تانا بانا الجھ کر رہ جاتا ہے، اگر چہ جاگے ہیں خواب میں صرف معاشرتی ناول نہیں ہے مگر اس کے واقعات اور کرداروں کے درمیان ایسا باہمی ربط موجود ہے جس سے

> پلاٹ بڑا گتھا ہوا محسوس ہوتا ہے اور کہیں بھی ناول کی دل کشی و دل چسپی متاثر نہیں ہوتی، اس میں موجود ربط و تسلسل اور مکالمات کی وسعت کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے، خاص طور پر نفسیاتی موضوع پر مصنف کی گرفت بڑی مضبوط ہے اور اس کے لئے اس کی علمی استعدادِ کار کی داد دنیا زیادتی کے زمرے میں شمار ہو گا۔(۴۷)

معاصر ناولوں میں صرف ظاہری حالت پر انحصار نہیں ہوتا بلکہ یہ انسان کے اندرونی و نفسیاتی کشمکش کی بھی ترجمانی کرتے ہیں۔ بھارت میں معاصر ناول نگاری میں تہذیبی و معاشرتی سروکار کے حوالے سے انور پاشا لکھتے ہیں:

> معاصر ناولوں میں نمایاں صفت یہ ہے کہ یہ عصری معاشرے کی خارجی حقیقتوں اور تجربوں کا ہی احاطہ نہیں کرتے بلکہ خارجی تجربے کے وسیلے سے ہماری ذات کے نہاں خانے میں آ کر ہماری خوابیدہ حس کو بیدار کرنے اور ہمارے ساکت وجدان میں تحرک پیدا کرنے کی سعی بھی کرتے ہیں، موضوعاتی تنوع کے لحاظ سے بھی معاصر ناول نگاری کا دامن یک رخا اور تنگ نہیں کہا جا سکتا۔(۴۸)

اردو اور ہندی کو اگر ایک زبان تصور کیا جائے تو آج اردو دنیا کی چند بڑی زبانوں میں شامل ہے۔جو ہندوستان جیسے کثیر آبادی والے ملک اور پاکستان کے کونے کونے میں موجود لوگ سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے سے اپنے خیالات ، جذبات اور احساسات اسی زبان میں دوسروں تک پہنچاتے ہیں ۔ ہندوستان میں بننے والی فلمیں اور ڈرامے پاکستان میں بڑے شوق سے دیکھے اور سمجھے جاتے ہیں،اور پاکستان میں بننے والی فلمیں اور ڈرامے ہندوستان میں دیکھے اور سمجھے جاتے ہیں۔ دونوں ملکوں کے شہری جب مکالمے کرتے ہیں تو اسی زبان میں کرتے ہیں۔اس وجہ سے راقم سمجھتا ہے کہ اردو اور ہندی ایک ہی زبان ہیں۔لیکن بدقسمتی سے ہندوستان میں جب اردو ہندی تنازعہ شروع ہوا تو یہ تاثر دیا گیا کہ ہندی ہندوؤں کی زبان ہے اور اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اس تنگ نظری کی وجہ سے نقصان یہ ہوا کہ ہندی زبان سے عربی اور فارسی کے حروف نکالے جانے لگے اور اسی کے مقابلے میں اردو سے سنسکرت اور ہندوستان کی مقامی زبانوں کے کے الفاظ کو رفتہ رفتہ نکالا جانے لگے۔اور مفرس و معرب لفظوں کی تائید شروع ہوگئی جس کی وجہ

سے دونوں مذاہب کے ماننے والے اور اقوام نہ صرف معاشرتی بلکہ تہذیبی اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔

اردو زبان و ادب اب عالمی سطح پر پاکستان کی پہچان بن گیا ہے ۔ اسی زبان کے ذریعے لوگ ہماری تہذیب، ثقافت اور تاریخ سے آشنائی حاصل کرتے ہیں۔ناول ادب کی وہ صنف ہے جس کا دائرہ کار بہت وسیع ہے، صدیق الرحمان قدوائی لکھتے ہیں :

> یوں تو ادب کی ہر صنف میں کسی نہ کسی تہذیب کے رنگارنگ عکس دیکھتے جا سکتے ہیں، مگر ناول کا پھیلا ہوا دامن اپنے اندر جلوے سمیٹ لیتا ہے ، اس کا امکان کسی اور صنف میں نہیں ۔ پھر ایک ایسی زبان کے ناول ، جو ملک کے کسی ایک خطے میں محدود نہ ہو ، بل کہ ہر علاقے میں پہنچ کر وہیں کی ہو رہی ہواور پھر آزادانہ طور پر پھیلنے پھولنے لگی ہو ، اس کی وسعتوں کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ۔ اردو کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنے علاقے میں قدم رکھنے کے ساتھ ساتھ ملک کے دوسرے خطوں میں کچھ اسی طرح اپنا لی گئی کہ وہاں کے رہنے والوں کی نگارشات میں ان کی سرزمینوں کی دل کشی سماتی چلی گئی۔اردو ناول میں علاقائی تہذیبوں کی جلوہ گری دیکھیے تو ان کی روشنیوں کی چمک سے عجیب وغریب سماں نظر آئے گا۔(۴۹)

اختر رضا سلیمی کے اس ناول کے سب سے اہم حصہ گندھارا کی تہذیب کے ساتھ ساتھ سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد اور مقامی لوگوں کا سکھوں کے خلاف ردعمل پر مشتمل ہے۔ ہزارہ اور ٹیکسلا کی تاریخی و تہذیبی حیثیت جگہ جگہ ناول میں جھلکتی ہے۔محمد شعیب لکھتے ہیں:

> اختر رضا سلیمی نے مارگلہ، ٹیکسلا اور اس کے گردونواح کے ساتھ ساتھ ہزارہ کے علاقوں کی قدیم تہذیب کو اپنے ناول میں مصورانہ طریقے سے نقش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں آثار قدیمہ کہ جلوؤں نے مزید رنگ بھر کر عالمی منظر میں اس علاقے کے پوٹریٹ کو نمایاں کر دیا ہے۔(۵۰)

جاگے ہیں خواب میں میں جو مناظر دکھائے گئے ہیں وہ مسحور کن ہیں۔ اس ناول میں ناول نگار کی شخصیت پس منظر میں رہتی ہے۔ زمان و مکان کو ناول نگار نے کچھ اس انداز سے پیوست کیا کہ قاری کو داد دینا پڑتی ہے۔ محمد شعیب لکھتے ہیں:

> جاگے ہیں خواب میں ایک منظری ناول بھی ہے اور اس ناول میں ناول نگار کی اپنی شخصیت پس منظر میں نہیں رہتی بل کہ غائب ہو جاتی ہے۔ یہ تکنیک موپاساں کے ہاں عام ہے اور دیگر لکھاریوں نے بھی اس کو اختیار کیا ہے، اردو میں زیادہ تر ناول اسی تکنیک کے حامل دکھائی دیتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے اپنے ناول میں اسی طریقہ کار کو اختیار کیا ہے۔ مگر اس میں مصورانہ انداز بھی حاوی ہے۔ اور مصنف کا کینوس بڑا وسیع ہے۔ اس ناول کی ایک اور خصوصیت ،زمان و مکان کی بڑے فنکارانہ طریقے سے بندش ہے۔ قاری ایک منظر سے اچانک اسی طرح کئی صدیوں پیچھے چلا جاتا ہے کہ اس کا ذہن اس صورت حال کرنے میں پس و پیش نہیں کرتا، پھر منظر اور پس منظر کی عکاسی کے دوران میں کوئی بات تشنہ نہیں رہتی اور ابلاغ کی تمام راہیں وا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ مصنف کا یہی طریقہ اسے معتبر بناتا ہے کہ وہ قاری کے سامنے منظر کے تمام نقش اس طرح تازہ کریں کہ نگاہوں میں اس کی تصویر بنتی چلی جائے۔(۵۱)

قصہ یا کہانی میں ناول بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ ناول کو کرداروں کے ذریعے ہی آگے بڑھایا جاتا ہے۔ اور یہ تمام کردار مصنف کی گرفت میں ہوتے ہیں چاہے تو اسے آخر تک ناول میں رکھے، چاہے تو اسے مروا دے۔ناول کا مرکزی کردار زمان ہے۔ زمان کے علاوہ ماہ نور ایک کردار ہے جو زمان کی محبوبہ ہے اور یونیورسٹی میں اس کی ہم جماعت ہے۔عزیز خان جو زمان کا والد ہے وہ پڑھا لکھا جاگیر دار ہے۔ اس کے باپ دادا نے انگریز کا ساتھ دیا تھا، جس کے عوض ان کو جاگیر ملی۔گل زیب ان کا گھریلو ملازم جو کہ ایک سیدھا سادہ انسان ہے۔عرفان اس ناول کا عجیب وغریب کردار ہے۔ یہ وہ کردار ہے جو کہ گاؤں میں اچانک نمودار ہوتا اور وہ اچانک غائب ہوتا ہے۔عرفان کے خیالات اور شخصیت کو دیکھ کر قاری کو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گویا اس نے سراغِ زندگی پایاہے۔ عرفان ایک وسیع النظر انسان ہے۔ وہ طبعیاتی اور مابعد

الطبعیاتی علوم دونوں پر یکساں عبور رکھتے ہیں اور دونوں کو ایک دوسرے کے مددگار خیال کرتے ہیں۔وہ پہلی ہی ملاقات میں زمان کی ذہانت اور تجسس مزاج طبیعت سے واقف ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس کے ساتھ مختلف علوم پر بحث کرتا ہے۔ زمان پہلی ہی ملاقات میں عرفان سے متاثر ہوتا ہے اور اس کا خیال رکھنا شروع کرتا ہے۔ حالاں کہ گاؤں کے لوگ عرفان کو مشکوک نظروں سے دیکھتا ہیں۔عرفان کے پاس ایک تھیلا ہوتا ہے جس پر''غاوسہ فردوس'' کے الفاظ درج ہیں۔ یہ وہ یہ وہ الفاظ ہیں جو گوتم کے ایک پیروکار آنند کے تھیلے پر لکھے ہوتے تھے۔عرفان زمان کو مختلف کتابیں پڑھنے کے لیے دیتا ہے جن میں سے دومشہور ناول ٹائی ٹینگ کی تباہی اور چاند کا سفر جیسے ناول ہوتے ہیں۔ڈاکٹر مسیح الدین فاروقی زمان کا علاج کرنے والے ڈاکٹر ہیں ۔ جب زمان کوما میں جاتا ہے اور خطائے حس جس کا شکار ہوتا ہے تو ڈاکٹر اس کو ہوش میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔لیکن زمان کا مسئلہ اتنا پیچیدہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو پوری طرح سمجھ نہیں پاتے۔اس میں ڈاکٹر فاروقی نفسیات او رانسانی ذہن کے متعلق مختلف قسم کے انکشافات کرتا رہتا ہے۔

ڈاکٹر کلیم پرانی زبانوں اور آثار قدیمہ کا ایک ماہر ہے، جب زمان اشوک کے دور میں کندہ کرائی گئی عبارت کو دریافت کرتا ہے تو زمان کے والد عزیز خان ، ڈاکٹر کلیم کو بلاتے ہیں اور وہ اس عبارت کو پڑھنے میں کامیاب ہو جاتا ہیں ۔لیکن اس دریافت کی خبر ، ایک کارنامے کی صورت اخبار میں اپنے نام سے شائع کروائی ہے۔

اکبر خان زمان کے رشتہ داروں میں سے ہے۔ زمان نے اس کو چٹان سے ٹکرا کر مرتے ہوئے دیکھا ہوتا ہے۔جو بعد میں اسی طرح مرا۔ ماریہ زمان کی بیوی ہے۔ امر سنگھ ہزارہ میں سکھ راجہ ہے ۔یہ وہ راجہ ہے جو زمان کے جدِامجد نور خان ،عبداللہ اور احمد خان کے ہاتھوں مارا گیا ہوتا ہے کیونکہ امر سنگھ نے ان کے گاؤں پر حملہ کیا گیا تھا اور ان کے قبیلے کو علاقے سے دربدر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے گھروں کو بھی لوٹا۔

سید احمد بریلوی جو کہ ہندوستان میں تحریک جہاد کا امیر تھا اور جب پشاور میں مقامی قبائل نے سید احمد بریلوی کے خلاف بغاوت کیں تو سید احمد بریلوی کو ہزارہ آنا پڑا۔ ہزارہ میں چوں کہ سکھوں کی حکومت تھی۔اس وجہ سے سکھوں اور سید احمد بریلوی کے مریدوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ زمان کے جد امجد اس

جنگ میں سید احمد بریلوی کا ساتھ دیتے ہیں کیونکہ وہ پہلے ہی ان کے ہاتھوں پر بیعت کر چکے ہوتے ہیں۔اس جنگ میں سید احمد بریلوی کے لشکر کو شکست ہوتی ہے ۔فقیر محمد خان نور خان کا بیٹا ہے ۔ جب ۱۸۴۱ء کی بارشوں میں نور خان کا مکان گر جاتا ہے تو چھوٹا فقیر محمد خان بچ جاتا ہے۔فقیر محمد خان کا بیٹا ظفر علی خان ہے جو کہ خاموش طبع اور درویش مزاج آدمی ہے۔ اور زیادہ تر تنہائی میں رہنا پسند کرتا ہے۔بعض لوگ اس کو بزرگ تصور کرتے ہیں اور بعض کے مطابق اس پر جنوں کے دورے پڑتے ہیں ۔ظفر علی خاں کا پوتا عزیز خان اور عزیز خان کا بیٹا زمان ہے جو کہ جینیاتی طور پر پر اپنے لکڑ دادا ظفر علی خان سے مماثلت رکھتا ہے ۔ اس میں خاتون صابرہ خانم بھی ہے جو کہ ایک مزارع کے بیٹی ہے اور ظفر علی خان اس کے حسن سے متاثر ہو جاتا ہے۔ بعد میں ظفر علی خان اور صابرہ خانم کی شادی ہوجاتی ہے ۔محمد شعیب ناول کے کرداروں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> کسی بھی قصہ یا کہانی کے بیان میں کردار نگاری ایک بنیادی جزو کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بغیر قصہ بیان نہیں ہوسکتا ،یہی کردار ناول میں ہر طرف بکھرے ہوتے ہیں اور مصنف انہیں اپنی اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے لے لیے حرکت میں رکھتا ہے۔کوئی بھی مصنف ان کرداروں کا ''خالق'' ہوتا ہے۔ اور اس کی مرضی کے بغیر یہ ایک قدم نہیں چل سکتے ۔ ان کی زندگی اور موت کے فیصلے مصنف کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔اب اس کے تخیل اور صلاحیت پر مشتمل ہے کہ وہ ان سے کس طرح کے مکالمے اگلواتا ہے، کس قسم کی حرکات کرواتا ہے اور ان کے عمل کا تمام دارومدار بھی مصنف کے ذہن کا مرہون منت ہوتا ہے۔اس لئے کردار نگاری کسی بھی قصے میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ جاگے ہیں خواب میں میں مصنف نے کردار نگاری کے نئے تجربے کئے ہیں ، اس میں ''زمان'' نامی شخص ہیرو ہے ، لیکن اس کے لاشعور میں کئی کردار اس کی شخصیت میں در آتے ہیں اور ناول کی کہانی ہر لمحے ایک نئے رخ پررواں دوراں ہوتی چلی جاتی ہے۔ کردار نگاری کے حوالے سے اس ناول کو مثالی کہا جا سکتا ہے۔(۵۲)

جاگے ہیں خواب میں کو تاریخی ناول بھی کہا جا سکتا ہے۔کیوں کہ اس میں ماضی بعید و ماضی قریب کے اہم تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں۔اشوک اعظم سے لے کر سید احمد بریلوی تک اور پھر ۲۰۰۵ء کا ہولناک زلزلہ جس میں ہزاروں لوگ ہلاک ہوئے تھے۔محمد شعیب لکھتے ہیں:

> جاگے ہیں خواب میں کو تاریخی ناول بھی کہا جاسکتا کیوں کہ اس میں آثار قدیمہ کے شانہ بشانہ تاریخی واقعات کو بھی تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔تاریخی واقعات میں مصنف کی مہارت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے قدیم تاریخ کے ساتھ، ماضی قریب کے تاریخی واقعات کو بھی ناول میں سمو دیا ہے۔(۵۳)

ایک ناول کو کس بنا پر تاریخی ناول کہا جا سکتا ہے اس حوالے سے ناقدین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔خالد اشرف لکھتے ہیں:

> تاریخی ناول نگاری سے متعلق اکثر یہ بحث اٹھائی جاتی رہی ہے کہ تاریخی ناول کے لئے واقعات کا کتنا قدیم ہونا ضروری ہے۔ویسے تو ہر گزرا ہوا لمحہ، وقت تاریخ بن جاتا ہے لیکن کیا گزرے ہوئے وقت کا احاطہ کرنے پر ہر ناول تاریخی ناول کہلایا جا سکے گا؟ یہ سوال نزاعی ہے۔کچھ مصنفین کا خیال ہے کہ تاریخ کو کم از کم پچاس یا سو سال پرانے واقعات کا احاطہ کرنا چاہیے، جب کہ جان میرٹ کہتا ہے کہ بعض ناول جو اپنے وقت میں تاریخی طور پر نہیں لکھے گئے وقت گزرنے پر تاریخی ناول کی شکل اختیار کر گئے۔(۵۴)

راقم سمجھتا ہے کہ اس ناول میں تاریخی اور تہذیبی حیثیت مسلم ہے۔اس ناول کی تاریخی حیثیت کے بارے میں محمد شعیب لکھتے ہیں:

> سلیمی صاحب کے مذکورہ ناول میں ماضی بعید اور ماضی قریب کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔وہ قدیم بدھ مت کی تاریخ تک جا پہنچے ہیں تو سید احمد بریلوی کی تاریخی جدو جہد کو بھی نہیں بھولتے اور اس سے بڑھ کر ۲۰۰۵ء میں شمالی علاقہ

> جات بالخصوص بالا کوٹ میں آنے والے قیامت خیز زلزلے کی تباہ کاریاں بھی بڑی سادگی و پر کاری بیان کر جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ناول تاریخی ضرورتوں سے بھی ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔(۵۵)

ناول میں'' شعور کی رو'' والی تکنیک بھی مغرب سے آئی ہے۔ یہ تکنیک اردو کے بہت سے ناولوں میں استعمال کی گئی ہے۔ اختر رضا سلیمی نے بھی اس تکنیک کو استعمال کیا جس کے متعلق محمد شعیب کا لکھنا ہے:

> اس ناول کی ایک منفرد بات یہ ہے کہ یہ آثار قدیمہ اور شعور و لاشعور دونوں کے ادغام سے کئی نفسیاتی پیچیدگیوں کو احسن طریقے سے کہانی کے روپ میں سامنے لاتا ہے۔ ناول میں شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال اس سے پہلے بھی کیا جا چکا ہے مگر بہترین استعمال جـــاگـــے ہیـــں خـــواب میـــں میں دیکھا جا سکتا ہے۔(۵٦)

شعور کی رو کیا ہے؟ اس کو کس نے استعمال کیا؟ اور اس اصطلاح کو ناول میں کیسے برتا جاتا ہے؟ اس حوالے سے یہ اقتباس نقل کرنا ضروری ہے:

> ''شعور کی رو کی اصطلاح علم نفسیات سے ماخوذ ہے۔ اسے وضع کرنے اور استعمال کرنے کا سہرا امریکی ماہر نفسیات ولیم جیمس کے سر جاتا ہے۔اس نے اپنی کتاب علم نفسیات میں شعور کی رو کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:
>
> Memories thoughts and feelings exist outside the primary conciousness and that they appear to me not as a chain but as stream flow.
>
> یعنی یاداشت ، خیالات اور احساسات جو ابتدائی شعور کی باہری سطح پر موجود ہوتے ہیں وہ مربوط ہونے کی بجائے بہتی ہوئی رو کی طرح ہوتے ہیں۔ اس وضاحت سے دو باتیں سامنے آتی ہیں ۔ اول یہ کہ شعور کی رو میں ربط وتسلسل

> نہیں ہوتا ، بل کہ یہ بے ترتیب اور غیر منظّم ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس میں ایک روانی ہوتی ہے، جو دھارے کی مانند بہتی رہتی ہے۔غرض کہ شعور کی رو اس ذہنی کیفیت سے عبارت ہے ، جس میں خیالات اور احساسات کا ایک دیا موجزن رہتا ہے اور جس میں ترتیب وتنظیم کی بجائے انتشار اور بکھراؤ کی کیفیت ہوتی ہے۔ انسان کے ذہن میں خیالات و احساسات کا یہ بہاؤ مستقل بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہتا ہے۔(۵۷)

کسی بھی تخلیق میں تخلیق کا ر کے ذاتی احساسات و جذبات کے علاوہ ان کے نظریات کو بھی بڑا دخل حاصل ہے۔ اگر ہم سرسید تحریک کے زیر اثر ادب کا مطالعہ کریں تو ہمیں ہر صفحے پر اصلاح کی کوششیں نظر آئیں گی۔ اور اگر ہم ترقی پسند ادب کا مطالعہ کریں تو ہمیں ہر افسانے ناول ،اور شاعری میں خارجی دنیا کی بے ترتیبی ، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف نفرت ، مزدوروں ، مزارع اور دیہاتیوں سے ہمدردی نظر آئے گی۔ یہی حال رومانوی ادب سے متاثرین کا ہے کہ ان کے ہاں خارجی دنیا سے فرار ہے۔بالکل اسی طرح اختر رضا سلیمی کے خیالات کا اس ناول پر بڑا اثر ہے ۔ اس حوالے سے ڈاکٹر اسلم آزاد لکھتے ہیں:

> ناول نگار ایک انسان ہونے کی وجہ سے خود بھی خیالات ومحسوسات کا مرکز ہوتا ہے اور زندگی کو ایک مخصوص نقطہ نظر سے دیکھنے کی وجہ سے دوسروں کے خیالات ومحسوسات سے بھی روشنی حاصل کرتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والوں پر ناول نگار کے نظریۂ مقصداور تصویر کا اثر پڑتا ہے۔(۵۸)

مصنف کی کہانی کاری کےفن کو سمجھنے کے لیے اس کی افسانوی تکنیک کی ہر قدم پر داددینا پڑتی ہے، ادبی اسلوب کو برقرار رکھتے ہوئے واقعات کے بیان اور مکالمہ نگاری کے دوران میں بھی گفتگو کو اس درجہ پر لطف بنا دیتے ہیں کہ ہر سطر سے تجسس اور مکالمے کا عین فطری ہونا معلوم ہوتا ہے۔ناول کے اہم کردار ’’گل زیب‘‘ کی بات کے جواب میں ایک دکاندار کے بیان میں موجود تجسس کی مثال بطورنمونہ بیان کیا جا سکتا ہے جس میں یہ عنصر آخر تک قائم رہتا ہے اور قاری چاہتا ہے کہ وہ بیان کردہ واقع سے مکمل طور پر آگاہ ہو سکے، لیکن یہاں افسانوی تکنیک سے کام لیتے ہوئے ،بات کو ادھورا چھوڑ کر سسپنس پیدا کیا گیا

ہے۔مکالمے سے ایک دل چسپ اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

> ہاں چاچا! آفتوں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے ۔ میرے دادا جی بتاتے ہیں کہ ان کے دادا طاعون میں مر گئے تھے، تو خوف سے کوئی ان کی لاش کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ طاعون سے مرے مرے ہوئے آدمی کی لاش کو اگر کوئی ہاتھ لگائے یا غسل دے تو اسے بھی طاعون ہو جاتا ہے، آخر میرے دادا جی کے ابا جی نے ہمت کر کے باپ کو غسل دیا اور دو اور لوگوں کی مدد سے انہیں مشکل سے دفن کیا تھا۔(۵۹)

ناول کا ایک اور اہم حصے کا نقش قاری کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے نقش ہو جاتا ہے۔ جب کہ اس حصے کی ناکامی ناول کی تمام محنت اور اور نزاکتوں کو نظر انداز کرتا ہے۔ اور اس کے اثر کو زائل کر سکتی ہے۔ یہ انتہائی اہم حصہ ناول کا اختتامیہ ہے ۔سینکڑوں یا ہزاروں صفحات میں بیان کردہ کہانی کے واقعات اور اس میں موجود فنی و فکری نزاکتیں ، ناول کے اختتام میں انتہائی سلیقہ مندی کی متقاضی ہوتی ہیں۔ذیل میں راقم تین کامیاب ناولوں کے اختتامیے سے پہلے پیش کریں گے، جن میں سارے ناول کی روح جھانکتی ہوئی محسوس کی جاسکتی ہے ۔سب سے پہلے عبداللہ حسین کا شہرۂ آفاق ناول اداس نسلیں کا اختتامیہ ملاحظہ کریں:

> گاؤں کے لوگ سادہ دل اور دیانت دار ہوتے ہیں اور وہ ہماری مدد کریں گے، یہ میرے بھائی نے کہا تھا اور یہ سچ ہے، ہم بھی گاؤں کے رہنے والے ہیں ، ہم وہاں کھیتی باڑی شروع کریں گے اور آہستہ آہستہ گھر بھی بنا لیں گے ۔گاؤں میں گھر بنانا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔تم فکر نہ کرو، کھلی جگہ کی آب و ہوا بھی مفید ہوتی ہے۔میرا بھائی۔۔۔وہ کراہ کر چپ ہوگیا۔'مجھے اپنے بھائی کے متعلق کچھ بتاؤ' 'ابھی وقت نہیں، پھر کسی وقت۔'
>
> دونوں خاموش ہو کر جھونپڑی میں لیمپ کی بتی کے بھڑک کر جلنے کی آواز سنتے رہے۔' تیل ختم ہو رہا ہے۔' علی نے سوچا۔ دیر تک وہ بتی کے بھڑکنے کا تماشا دیکھتے رہے۔ پھر بانو نے اٹھ کر تیل ڈالا۔

’تم باتونی تو نہیں ہو؟‘ اچانک علی نے پوچھا۔

’میں ۔۔بس ۔۔‘ بانو نظریں جھکا کر بولی: ’تم تو جانتے ہی ہو‘

تھوڑی دیر بعد چراغ کی بتی پھر بھڑکنے لگی اور ان کے سیاہی مائل ، بڑے بڑے ، محنتی اور دیانت دار چہرے ایک ساتھ اس کی طرف اٹھنے لگے۔ بانو نے اٹھ کر دوبارہ تیل ڈالا اور دھیمے لہجے میں اسے کمال کے بارے میں بتانے لگی۔(۶۰)

اب ایک اور معروف ناول راجہ گدھ کا اختتام پیش ہے۔ ناول میں موجود فکر سے قاری کو اختلاف ہوسکتا ہے لیکن اس کی تکنیک ، مربوط پلاٹ ، تجسس اور فطری مکالموں سے کوئی اختلاف نہیں کر سکتا۔ اس ناول کا اختتامیہ کچھ یوں ہے:

افراہیم خوابوں کی آخری سیڑھی پر سر بہ سجود تھا۔ میں پاگل پن کی پہلی اور اسفل ترین سیڑھی پر محبوب کھڑا تھا۔ اور ہم دونوں کے درمیان انسان کا مسئلہ ارتقا، کھینچی ہوئی کمان کی مانند فنا ہوا تھا۔ انسان کو ایب نارمل سے سوپر نارمل تک پہنچنے کے لیے جانے ابھی کس کس منزل سے گزرنا ہے؟(۶۱)

عصری ناول نگاری کے حوالے سے شمس الرحمان فاروقی کے نام سے کون واقف نہیں ہے۔وہ ہندوستان اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ ان کے ناول کئی چاند تھے سر آسماں اردو کے بڑے ناولوں میں شمار ہونے لگا ہے۔ اس کا اختتامیہ بھی خاصے کی چیز اور قابل توجہ ہے:

اگلے دن مغرب کے بعد قلعہ مبارک کے لاہوری دروازے سے ایک چھوٹا سا قافلہ باہر نکلا ۔ ایک پالکی میں وزیر، ایک بہل پر اس کا اثاث البیت، اور پالکی کے دائیں بائیں گھوڑوں پر نواب مرزا خان اور خورشید مرزا۔ دونوں کی پشت سیدھی اور گردن تنی ہوئی تھی ۔ محافظ خانے والوں نے روکنے کے لیے ہاتھ پھیلائے تو مرزا خورشید عالم نے ایک ایک مٹھی اٹھنیاں چونیاں دونوں طرف لٹائیں اور اور یوں ہی سر اٹھاتے ہوئے نکل گئے۔ ان کے چہرے ہر طرح

> کے تاثر سے عاری تھے، لیکن پالکی کے بھاری پردوں کے پیچھے چادر میں پڑی
> اور سر کو جھکائے بیٹھے ہوئے وزیر خانم کو کچھ نظر نہ آ تا تھا(۶۲)

اردو ادب درج بالا تین اہم اور شہرت یافتہ ناولوں کے اختتامیوں کے بعد اختر رضا سلیمی کے ناول جاگے ہیں خواب میں کے اختتامیے کا مطالعہ کیجیے، جس سے احساس ہوتا ہے کہ مصنف ان بڑے نثر نگاروں کی صف میں قدم رکھ چکا ہے اور اسے نہ صرف ناول کے فن پر مکمل عروج حاصل ہے۔ بلکہ اس کی وساطت سے ناول نگاری کو اردو نثر میں وہ طنطنہ حاصل ہے جو شاعری میں غزل کو حاصل ہے۔اکیسویں صدی کا نا تمام اختتام ایک اور نئی کہانی کو اپنے دامن میں کس خوبصورتی سے سمیٹے ہوئے ہے۔ملاحظہ کریں:

> ٹھیک ایک سال بعد ہزاروں پچھلے سال کی دوری سے آتی روشنی کی لہروں نے دیکھا کہ ماریا حویلی کے صحن میں بچھے پلنگ پر سوئی پڑی ہے اور اس کے پہلو میں تین ماہ کا بچہ اپنی ماں کی موجودگی سے بے خبر، ستاروں بھرے آسمان میں نظریں جمائے یوں ہاتھ پاؤں مار رہا ہے، جیسے ہر دور جاتے ستاروں کو پاس بلا رہا ہو، اپنے مرحوم باپ کی طرح اس کا پلکیں جھپکنے کا دورانیہ بھر حیرت انگیز حد تک طویل ہے، جب کہ اس کی بائیں ہتھیلی میں پیدائشی طور پر مندمل ہو چکے زخم کا ایک باریک سا نشان ہے۔اتنا باریک کہ یہ ابھی تک اس کی ماں کے مشاہدے میں بھی نہیں آیا، تاہم اس بات کا امکان موجود ہے کہ دولخت چٹائی، چبوترہ اس پر برابر نظر رکھے ہوئے ہیں ۔(۶۳)

مذکورہ بالا ناقدین کی آراء سے معلوم ہوتا ہے کہ اختر رضا سلیمی کا یہ ناول اپنے دل چسپ موضوع، تاریخی وتہذیبی کارفرمائی منفرد کہانی، عمدہ پلاٹ، متحرک کردار، جاندار مکالموں، خوب صورت مناظر، زبان و بیان کی دلکشی، زمان و مکان کی انفرادیت اور مصنف کے لازوال تخیل کے باعث اکیسویں صدی کے بڑے ناولوں میں ایک معتبر و قابل رشک اضافہ ہے۔

حوالہ جات

۱۔ آل احمد سرور، پروفیسر، مقدمہ، ناول کیا ہے،عزیز بک ڈپو، لاہور، ص ۲۰۷

۲۔ محمد شعیب (خزاں ۲۰۱۶ء) جاگے ہیں خواب میں، فنی و تجزیاتی مطالعہ، مشمولہ: خیابان، مدیر، بادشاہ منیر بخاری، جامعہ پشاور، ص ۱۴۰

۳۔ ایضاً، ص ۱۴۱

۴۔ عظیم الشان صدیقی، اردو ناول، آغاز و ارتقا، دہلی ایجوکیشنل، پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۸ء، ص ۳۲

۵۔ اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں، شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۳۰

۶۔ ایضاً، ص ۲۷

۷۔ ایضاً، ص ۲۸

۸۔ ایضاً، ص ۲۸

۹۔ ایضاً، ص ۱۷۴

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۷۴-۱۷۵

۱۱۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، تشکیک اور یقین کی حیرت انگیز کھتا، مشمولہ: آبشار، شمارہ نمبر ۴، مدیر محمد سلیم فواد کندی، فروری ۲۰۱۷ء، ص ۲۶۶

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۶۷

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۶۷

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۶۷

۱۵۔ اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں، ۲۰۱۵ء، ص ۳۷

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۶

۱۷۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، تشکیل اور یقین کی حیرت انگیز، کتھا، ص ۲۶۸

۱۸۔ اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں،۲۰۱۵ء،ص ۱۱

۱۹۔ محمد شعیب (خزاں ۲۰۱۶ء) جاگے ہیں خواب میں ،فنی و تجزیاتی مطالعہ،مشمولہ: خیابان، جامعہ پشاور،ص ۱۴۷

۲۰۔ سہیل بخاری، پروفیسر، اردو ناول نگاری، لاہور، مکتبہ جدید، ۱۹۲۰ء،ص ۲۰

۲۱۔ ایکسپریس ، ۲۵؍جون ۲۰۱۵ء ،تحریر غلام محی الدین

۲۲۔ قاسم یعقوب ، لاشعور کی نفسیاتی گرہیں اور کہانی کا خواب،مشمولہ: آبشار، شمارہ نمبر۴، مدیر محمد سلیم فواد کندی، اردو سخن پاکستان، ضلع لیہ، فروری ۲۰۱۷ء،ص ۲۶۶

۲۳۔ محمد سلیم الرحمان (۲۱مئی ۲۰۱۵ء) اپنے دل میں جمع کیا گیا کچھ مشمولہ: آبشار، شمارہ نمبر۴، مدیر محمد سلیم فواد کندی، اردو سخن پاکستان، ضلع لیہ، فروری ۲۰۱۷ء،ص ۳۰۰

۲۴۔ ایضاً،ص ۲۵

۲۵۔ قاسم یعقوب، لاشعور کی نفسیاتی گرہیں اور کہانی کا خواب،ص ۲۶۷

۲۶۔ وحید احمد، ڈاکٹر (۲؍اپریل ۲۰۱۵ء) شب کو کسی خواب میں آیا نہ ہو کہیں۔۔۔! مشمولہ: روزنامہ جہان پاکستان، اسلام آباد

۲۷۔ ایضاً

۲۸۔ اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں،لاہور ۲۰۱۵ء،ص ۱۸۵

۲۹۔ ایضاً،ص ۱۸۵

۳۰۔ اختر رضا سلیمی، خواب دان، دائرہ، سانجھ، پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۳ء، ص ۹۸

۳۱۔ صلاح الدین درویش، ڈاکٹر (جون ۲۰۱۵ء) جاگے ہیں خواب میں، چند معنوی جہتیں ،مشمولہ نقاط ،فیصل آباد، شمارہ نمبر ۱۳،ص ۳۷۰

۳۲۔ ایضاً،ص ۳۷۱

۳۳۔ ایضاً،س ۳۷۱

۳۴۔ ایکسپریس (۲۵؍جون ۲۰۱۵ء) تحریر غلام محی الدین

۳۵۔ قاسم یعقوب، لاشعور کی نفسیاتی گرہیں اور کہانی کا خواب،ص ۲۶۷

۳۶۔ اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں، ۲۰۱۵ء،ص ۲۲

۳۷۔ اسد محمد خان (پس ورق) جاگے ہیں خواب میں، از اختر رضا سلیمی

۳۸۔ اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں، ۲۰۱۵ء،ص ۱۱

۳۹۔ ایضاً،ص ۵۳

۴۰۔ ایضاً،ص ۵۸

۴۱۔ ایضاً، ۷۹

۴۲۔ ایضاً، ۱۰۱

۴۳۔ قاسم یعقوب ، لاشعور کی نفسیاتی گرہیں اور کہانی کا خواب،ص ۲۶۸

۴۴۔ اختر رضا سلیمی ، جاگے ہیں خواب میں،ص ۳۹

۴۵۔ ایضاً،ص ۱۲

۴۶۔ ایضاً،ص ۱۲

۴۷۔ محمد شعیب (خزاں ۲۰۱۶ء) جاگے ہیں خواب میں، فنی و تجزیاتی مطالعہ، مشمولہ: خیابان، جامعہ پشاور، ص ۱۴۸

۴۸۔ ایضاً،ص ۱۴۸

۴۹۔ صدیق الرحمان، قدوائی، ادب ثقافت اور دانشوری، نئی دہلی مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اکتوبر ۲۰۰۷ء،ص ۵۰

۵۰۔ محمد شعیب، (خزان ۲۰۱۶ء) جاگے ہیں خواب میں، فنی و تجزیاتی مطالعہ، اکتوبر ۲۰۰۷ء،ص ۱۵۰

۵۱۔ ایضاً،ص ۱۴۹

۵۲۔ ایضاً،ص ۱۴۹

۵۳۔ ایضاً،ص ۱۵۰

۵۴۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول ، دہلی، اردو مجلس ۱۹۹۴ء، ص ۳۰۱

۵۵۔ محمد شعیب (خزاں ۲۰۱۶ء) جاگے ہیں خواب میں ،فنی و تجزیاتی مطالعہ، مشمولہ خیابان، جامعہ پشاور، ص ۱۵۱

۵۶۔ ایضاً، ص ۱۵۲

۵۷۔ اسلم آزاد، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اکتوبر ۲۰۰۷ء، ص ۹

۵۸۔ ایضاً، ص ۱۰

۵۹۔ اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں، ص ۱۵۰

۶۰۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں ، لاہور، سنگ میل، پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص ۵۱۲

۶۱۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، نئی دہلی، شان ہند، پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص ۵۱۲

۶۲۔ شمس الرحمان فاروقی، کئی چاند تھے سر آسمان، نئی دہلی، یاترا بکس، ۲۰۰۶ء، ص ۶۴۵

۶۳۔ اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں، ص ۲۴۷

بابِ سوم

ناول کا تاریخی مطالعہ

ہزارہ کا جغرافیاتی، تاریخی اور ثقافتی تعارف

ا۔ ہزارہ تاریخی، جغرافیائی پس منظر

ہزارہ جو فلک بوس اور برف پوش پہاڑوں کے علاوہ خوبصورت وادیوں، سرسبز و شاداب میدانوں اور شفاف چشموں، جھیلوں اور ندیوں پر مشتمل جنت نظیر خطہ ہے۔ چونکہ قدیم تہذیبوں کا مسکن و مرکز بھی رہا ہے۔ خاص کر ٹیکسلا جو بدھ تہذیب کا مرکز تھا اور اس میں ایک یونیورسٹی بھی تھی جس میں مختلف علوم پڑھائے جاتے تھے۔ ہزارہ چونکہ ٹیکسلا کے ساتھ ہی ہے اس وجہ سے بدھ تہذیب کے اثرات ہزارہ پر بھی زیادہ ہوتے۔

ہزارہ کے حسن و جمال کے بارے میں شعراء نے صرف خوبصورت گیت لکھے بلکہ اس دھرتی سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار نظم و نثر ہر دو اصناف میں کیا ہے۔ سید واجد رضوی رضوی ہزارہ شعراء کی نظر میں کی تقریظ میں لکھتے ہیں!

> اس کے ہر زرہ میں طوفان حسن برپا ہے چشموں کے تبسم میں دریاؤں کی روانی ہے۔ پرندوں کے ترنم میں، فضاؤں کے تکلم میں یہی حسن موجود ہے یہ حسن فطرت کی آبرو ہے۔ قدرت نے پردہ وجود کو دامن لالہ و گل کو چاک کر کے حسن ازل کو ہزارہ میں وا کر دیا ہے۔ انجم اس کے ہم نشین ہیں۔ مہر و ماہ اس کے رقیب ہیں۔ اس کی فضائیں وادی ایمن کا نور ہیں اور برف پوش چوٹیاں پریوں کی مانند قطار در قطار اہل نظر کو دعوت فکر دیتی ہیں۔ دلوں کو گرماتی ہیں اور شاعروں کو تڑپاتی ہیں[۱]

چنانچہ اقبال، فراز، قتیل شفائی اور دوسرے کئی نامور شعراء نے اس علاقے کے ان دل کش نظاروں کو اپنے اندر سمو کر یادگار اور انمٹ تخلیقات کی صورت میں پیش کیا ہے۔ علامہ اقبال کی نظمی ابر کے یہ اشعار اس خطے پر بالکل صادق آتے ہیں۔

"اٹھی پھر آج پورب سے کالی گھٹا
سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سربن کا

عجیب خیمہ ہے کہسار کے نہالوں کا

یہیں قیام ہو وادی میں پھرنے والوں کا ۳

قتیل شفائی بھی ہر پور سے متعلق نظم ہرپورہ میں یوں فرماتے ہیں۔

اس کے ہر رنگ کو، ہرنور کو زندہ رکھنا

یا خدا میرے ہری پورکو زندہ رکھنا

احمد فراز نے اپنی نظم ایبٹ آباد میں اس شعر کا ایسا حسین نقشہ کھینچا ہے کہ بندہ جب ان اشعار کو پڑھتا ہے تو جھوم اٹھتا ہے۔

ابھی تلک ہے نظر میں وہ شہر سبزہ و گل

جہاں گھٹائیں سر راہگذار جھومتی ہیں

جہاں ستارے اترتے ہیں جگنوں کی طرح

جہاں پہاڑوں کی قوسیں فلک کو چومتی ہیں

تمام رات جہاں چاندنی کی خوشبوئیں

چنار و سرو کی پرچھائیوں میں گھومتی ہیں ۴

یہ خطہ جہاں نظر و حسن و شادابی میں منفرد ہے۔ وہاں کئی قدیم تہذیبوں کا امین و مسکن بھی رہا ہے۔ اس خطے میں پائے جانے والے آثار و علائم اپنی خاموش زبان میں اس کی عظمت رفتہ اور تہذیبی و تمدنی زندگی کی ایک لمبی داستان بیان کرتے ہیں۔ ہزارہ کی وجہ تسمیہ کے متعلق کئی آراء پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر لیٹنر کا خیال ہے کہ یونان کے سکندر اعظم کے حملے سے پہلے ہزارہ دردستان کہلاتا تھا اور دارا خاندان کے زیر تسلط ہونے کی وجہ سے دردستان کہلاتا ہے۔ ۵ اسی طرح مشہور چینی سیاح جو مذہباً بدھ مت کا ماننے والا تھا۔ اس نے ہزارہ کو والیولاشی Volue, la, Shi کے نام سے پکارا ہے وہ اس علاقے میں ساتویں صدی عیسوی میں آیا تھا وہ علاقہ بدھ مت کے لئے مقدس سرزمین تھی۔ سینکڑوں لوگ یہاں زیارت کرنے آتے تھے ۶ ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی اپنی کتاب تاریخ ہزارہ میں لکھتے ہیں۔

اس علاقے ہزارہ کو راجہ ابی ساریز کے ماتحت ہونے کی بنا پر ابی ساریز کا نام دیا
گیا ابی ساریز کشمیر کا راجہ تھا۔ ہزارہ میں شامل بیشتر علاقے ایک وقت میں
اورش یا رش بھی کہلائے۔ ے

آج بھی یہ نام اورش یارش کے حوالے سے مشہور ہے۔ بعض پرانے اردوشعراء کے ہاں کئی گیتوں اور نظموں میں یہ نام ملتا ہے۔ مشہور شاعر اسرائیل مہجور کی اورش نام کے حوالے سے ایک خوبصورت نظم بشیر احمد سوز نے اپنی کتاب ہزارہ شعراء کی نظر میں لکھی ہے جس کا پہلا شعر یوں ہے کہ:

خط اورش تری رنگین بہاروں کو سلام
تیری وادی کے سفیدوں اور چناروں کو سلام

تقریباً ہر مورخ نے اس نام کی وجہ تسمیہ کے حوالے سے مختلف رائے قائم کی ہے تاہم اس نام کی وجہ تسمیہ پر معتبر رائے مسٹر ویس کا ہے جو 1876ء میں ہزارہ کا منتظم تھا۔

ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی ہزارہ کی وجہ تسمیہ سے متعلق مسٹر ویس کی رائے بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

''چونکہ اس علاقے ''میدان ہرپور'' میں قوم ترک المعروف قارلق کا قبضہ ہے اس لئے یہ میدان قارلق ہزارہ مشہور ہے۔ حقیقت میں یہ علاقہ ان ترکوں کے نام پر مشہور ہے جن کو امیر تیمور نے خود یہاں چھوڑا یہ ایک ہزارہ کا لشکر قبیلہ قارلق ازقوم ترک تھا۔ لہذا اس علاقے کا نام قارلق ہزارہ پڑ گیا'' ۹

ڈاکٹر صاحب کے مطابق آئین اکبری اور تزک بابری میں بھی یہی نام ہزارہ قارلق لکھا ہے۔ اس وجہ سے ڈاکٹر خان بہادر خان پنی آگے لکھتے ہیں۔

1399ء میں جب امیر تیمور کی آمد اس علاقہ میں ہوئی تو اس زمانہ میں فوجی عہدے سپاہی دستوں کے تعداد سے متصور ہوتے تھے۔ مثلاً پنج ہزاروی، ہفت ہزاروی وغیرہ چنانچہ ایک ہزار منگ بھی ایک ہزار سپاہیوں کا دستہ جس علاقے سے لیا تھا۔ اس نسبت سے اس کو پکارا جاتا تھا۔ جس قوم کے ایک ہزار سپاہیوں

> کے دستے کو یہاں متوطن کیا گیا۔ وہ قوم قارلق سے تعلق رکھتا تھا۔ چنانچہ اس وجہ سے اس علاقے کا نام قارلق ہزارہ رکھا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صرف ہزارہ رہ گیا۔۱۰

یہ نام کافی عرصہ تک صرف ہرپور کے علاقے کے لئے خاص تھا۔خواص خان اپنی کتاب دیـــــوان راجا بابا میں لکھتے ہیں۔

> کم وبیش چارسو سال تک تحصیل ہرپور کا وسیع میدان اسی نام (ہزارہ قارلق) سے موسوم رہا۔ انگریزی عہد کے آغاز میں بھی سرکاری کاغذات میں (ہزار قارلق) لکھا جاتا رہ، جو رفتہ رفتہ صرف ہزارہ رہ گیا۔۱۱

پس منظر:۔ ہزارہ کی تاریخ صدیوں پر محیط ہے۔ اس لئے مختلف ادوار میں مختلف اقوام اس سرزمین میں آئیں۔ اورحکومتیں کرتی رہیں۔ ہزارہ کی دھرتی چونکہ زرخیز ہے۔ اس وجہ سے ہر دور میں یہ حکام کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔اختر رضا سلیمی اپنی نظم اک بے نام بستی کے کچھ مناظر میں یوں فرماتے ہیں۔

یہاں زمین وہی ہے لیکن کچھ ایسی زرخیز
یوں لگتا ہے جیسے یہاں کی خاک ہے خواب آمیز
دھرتی ہر دو پاؤں رکھو تو نقش پا کی بجائے
قدم اٹھانے سے پہلے ہی سبزہ اگ آئے
اور فلک شفاف ہے ایسا آنکھ اٹھاؤ تو
وہ بھی دکھائی دیتا ہے موجود نہیں ہے جو
وہی فضا ہے ۔ یہاں بھی لیکن شور سے ایسی خالی
کانوں میں رس گھولتی پھرتی میری ہریالی
ہریالی کی سرگوشی میں ہے اک ایسی تان

تان سین بھی سن کر جس کو رہ جائے حیران
دور رفق پر تیر رہے ہیں پنچھی پر پھیلائے
جو بھی یہ منظر دیکھے وہ دیکھتا ہی رہ جائے۔۱۲

ماضی میں بہت ساری اقوام نے ان کے طرف رخ کیا اور اس کو آباد کیا۔ پروفیسر افتخار احمد لکھتے ہیں۔"ہندوستان کا شاید ہی کوئی ضلع حسن میں ہزارہ کے مقابل کا ہو۔ مناظر کی دلکشی اس کا نہ ختم ہونے والا تنوع ہے۔"۱۳

یہی وجہ ہے کہ یہ جنت نظیر ٹکڑا ہمیشہ میدان جنگ بنا رہا۔ اور اس پر اپنا قبضہ جمانے اور فتح کے جھنڈے گاڑنے کی کوششیں کی گئیں۔ اس کے حدود میں بھی کمی بیشی ہوتی رہی۔ لیکن اس کی فطری حدود بحر حال قائم رہے۔ جیسا کہ سب کو پتا ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے آریہ قوم کے لوگ آئے۔ اس وجہ سے آریاؤں نے ٹیکسلا سے ہوتے ہوئے ہزارہ پر قابض ہو گئے۔ یہاں کچھ عرصہ کے لئے مقیم رہے آریاؤں کی یہاں بودوباش کی وجہ سے مقامی تہذیب پر ان کے اثرات ہوئے۔ اس دوران یعنی قبل از مسیح بدھ مت کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ بدھ مذہب نے سب سے زیادہ اس خطے کو متاثر کیا۔ جب اشوک اعظم نے جنگوں میں لاکھوں لوگوں کو تہہ تیغ کیا تو ان کو سخت صدمہ پہنچا۔ اور بالآخر بدھ مت مذہب کو اختیار کیا جو امن و آشتی کا مذہب تھا جس میں انسان اور جانور تو درکنار کسی کیڑے کو بھی مارنے کی اجازت نہ تھی۔ اشوک اعظم نے اپنے ظلموں کی تلافی کے لئے ہندوستان بھر میں فلاحی و رفاہی کاموں کا آغاز کیا۔ جگہ جگہ کنویں بنائے۔ راستے بنائے گئے۔ جگہ جگہ مسافروں کے لئے سرائے بنائے۔ یعنی یہ وہ دور تھا جس میں ہندوستان نے خوب ترقی کی۔ اور انسان دوستی کو بدھ مت کی وجہ سے فروغ حاصل ہوا۔ ان خصوصیات کی وجہ سے یہ دھرم پوری ایشیا میں پھیل گیا۔ علم و ادب نے خوب ترقی کی اسی زمانے میں ٹیکسلا بدھ تہذیب کا مرکز تھا جس میں ایک یونیورسٹی بھی تھی۔ یہ زمانہ چوتھی صدھی قبل از مسیح کا تھا۔ اس کے بعد یونانی تہذیب کو دنیا میں عروج حاصل ہوا۔ سکندر اعظم فتح کے جھنڈے گھاڑتا ہوا ہندوستان پہنچا۔ اس نے ٹیکسلا کے راجہ امب سے حکومت چھینی لیکن خود یہاں زیادہ عرصہ نہیں رہا۔ اور یہ علاقہ ریاست پونچھ کے راجہ ابی ساریز کے حوالے کر کے چلا گیا۔۱۴ یہ وہی راجہ ہے جس کی وجہ سے اس علاقے کا نام ابی ساریز پڑا۔ سکندر اعظم کو واپس گئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ چندرگپت نے بڑے خونریز معرکوں کے بعد اس علاقے پر قبضہ کر لیا

اور موریہ خاندان کی حکومت کی بنیاد ڈالی اور اپنی ریاست کی حدود میں بھی وسعت لانے کی کوشش کی۔ اس خاندان کی حکمرانی چندر گپت کے پوتے اشوک تک قائم رہی۔ 272ء قبل مسیح میں اشوک نے کئی فرمان پتھروں پر مستقبل یادگار کے طور پر ہزارہ میں چھوڑے۔ بڑے بڑے پتھروں پر کندہ یہ فرمان آج بھی مانسہرہ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔۱۴ اس فرامین کا ذکر جا گے ہیں خواب میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ جس کے ذریعے ناول کو آگے بڑھا دیا گیا ہے۔ دوسری صدی عیسوی میں داستانوی ہیرو راجہ سالو نے اقتدار حاصل کیا اور اس خاندان سے یکے بعد دیگرے کئی لوگ حکمران رہے۔ راجہ جے پال ان خاندان کا سب سے اہم اور نمایاں حکمران رہا۔۱۵ تاہم راجہ سالو کے بارے میں ہزارہ میں کئی اساطیری کہانیاں مشورہ ہیں۔ راجہ سالو کے دور سے قبل بدھ مذہب کو غلبہ حاصل رہا تھا۔ دوسری صدی عیسوی تا ساتوں صدی عیسوی تک ہزارہ پر ہندو حکمرانوں کا غلبہ رہا۔ جب ہندو شاہی حکومت پر زوال آیا تو یہ علاقہ دوبارہ کشمیری حکمرانوں کے قبضے میں چلا گیا۔ کشمیری حکمرانوں میں کالا شان اور سوسالا اس دور کے اہم حکمران تھے۔ ۱۶ اٹھویں صدی کے آغاز میں اس علاقے میں اس علاقے میں گکھڑ قوم کے لئے لوگ آئے اور یہاں آباد ہو گئے پھر اس کے بعد جو قومیں ہزارہ کے علاقے پر اثر انداز ہوئی۔ ان میں خاندان غزنویہ کے حکمران تھے۔ یہ حکمران 985ء تا 1186ء تک اثر انداز رہے ۱۷۔ بارہویں صدی میں محمد غوری نے ہندوستان پر حملہ کیا اس کے کمانڈر امانت خان تھے۔ امانت خان نے ہزارہ کو فتح کیا تاہم وہ زیادہ دیر تک اقتدار کو قائم نہ رکھ سکا اور یہ علاقہ سابقہ حکمرانوں کے قبضے میں دوبارہ آ گیا۔ امیر تیمور جو ترک تھا۔ 1399ء میں ہندوستان پر فتح کے جھنڈے گاڑتا ہوا آتا ہے اور دہلی کو تباہ کرتا ہوا جموں کشمیر اور شمالی مغربی علاقوں تک پہنچتا ہے۔ واپسی پر خضر خان کو شمالی مغربی مقبوضہ جات کا نگران مقرر کرتا ہے اور ایک ہزار سپاہیوں کو متوطن کر کے واپس چلا جاتا ہے۔ مذہب اسلام سے اہل ہزارہ کی آشنائی اس دور سے ہوتی ہے۔۱۸

پندرھویں صدی کے آخر میں شہاب الدین نامی شہزادے نے یہاں ایک ریاست قائم جسے تاریخ کی دستاویز میں پکھل سرکار لکھا گیا۔ ابتداء میں اس ریاست کی حدود بڑی مختصر اور محدود تھیں۔ تاہم بعد میں شمالی اور جنوب کی طرف ان کو وسعت دی گئی۔ تاہم اس ریاست کے حکمران آزاد نہ تھے۔ اور دہلی حکومت کے ماتحت تھے۔ یہاں مغلوں کا اقتدار مستحکم ہو چکا تھا۔ مغل دور میں ہزارہ ایک انتظامی علاقے کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب مغلیہ سلطنت پر انحطاط آیا تو دوسرے سلطنتوں کی طرح ہزارہ میں بھی کافی تغیرات ہوئے۔

سترھویں صدی میں سواتیوں نے پکھل پر حملہ کیا۔ یہ سوات کے باشندے تھے اور دہلی پر جہانگیر کی حکومت تھی۔ اس کے علاوہ تنولی اور جدون قبیلے کے لوگوں نے بھی اس علاقے پر یورش کیا۔ اٹھارویں صدی میں جب مغلیہ سلطنت زوال کی طرف چلی پڑی تو اس اس پراشوب اور نازک دور میں جبکہ ہندوستان میں مغلوں کی گرفت کمزور پڑی ہوئی تھی۔ نادر شاہ نے حملہ کیا جس سے دہلی ایک دفعہ پھر تباہ و برباد ہوئی۔ اس کے بعد احمد شاہ ابدالی آیا جس نے دہلی کو فتح کرنے کے بعد شمالی مغربی علاقے پر بھی اپنی تسلط قائم کر دی۔ اس کے علاوہ کشمیر اور پنجاب میں بھی اس کا کنٹرول قائم ہوا۔ احمد شاہ ابدالی یہاں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکا اور حکومت درانیوں کے حوالے کر کے واپس افغانستان چلا گیا چنانچہ 1747ء سے 1818ء تک درانی اس علاقے پر حاکم رہے۔

اٹھارویں صدی کے آغاز میں جلال بابا کی سرکردگی میں سواتی لوگ شمالی مغربی پہاڑوں کو فتح کیا اس علاقے پٹھانوں سے پہلے گجر قوم تھی۔ پٹھانوں نے گجروں سے علاقے چھینے اور حاکم بن بیٹھے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں بھی درانی کمزور ہو گئے۔ اور سکھوں کو عروج حاصل ہونے لگا اس وقت پنجاب میں سکھوں کا اثرورسوخ بڑھنے لگے تھا۔ پنجاب پر جب رنجیت سنگھ کا قبضہ ہوا۔ رنجیت سنگھ آہستہ آہستہ اپنی ریاست کو توسیع دیتا رہا اور کشمیر و پشاور کو اپنی ریاست کا حصہ بنایا۔ اب رنجیت سنگھ کے لئے آسان تھا کہ وہ ہزارہ پر قبضے کر سکے اور بالآخر اس نے ہزارہ پر قبضہ کر ہی لیا۔ رنجیت سنگھ نے ہری سنگھ کو ہزارہ کا حکم بنایا۔ 1822ء سے 1837ء تک ہری سنگھ نے ہزارہ پر حکومت برقرار رکھی اگرچہ ہری سنگھ کو اس دورانیے میں کئی بغاوتوں کو کچلنا پڑا تاہم سب سے بڑا معرکہ سکھ فوج کو اس دوران میں سید احمد بریلوی سے لڑنا پڑا تھا۔ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید اس تحریک کے سرخیل تھے۔ انہوں نے ہزارہ میں سکھوں کے خلاف لڑائی لڑی کیا تاہم اپنوں کے بے وفائی اور غداری کی وجہ سے وہ سکھوں کے ہاتھوں بالاکوٹ کے مقام پر شہادت پا گئے [۱۹]۔ جب تک رنجیت سنگھ زندہ رہا تو سکھ اقتدار مستحکم تھا لیکن جب وہ مر گیا تو سکھ حکومت آہستہ آہستہ کمزور ہوتی گئی۔ اقتدار کے لئے رسی کشی میں درجن سے زیادہ حاکموں کو قتل کیا گیا اسی وقت برطانوی حکومت ہزارہ پر نظریں جمائی تھی۔ اگرچہ سکھ کسی بھی صورتحال میں اپنی حکومت کھونے کے لئے تیار نہ تھے۔ سکھوں نے انگریزوں کے خلاف اچھی خاصی مزاحمت کی اور ملتان میں انگریز سرکار کے خلاف بغاوت کیا۔ ڈاکٹر خان بہادر پنی اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

> سکھ اپنی سلطنت کا احیاء چاہتے تھے۔ اس لئے انھوں نے مول راج کو اپنی امداد کا یقین دلا کر بغاوت کے لئے اٹھایا۔ میجر ایبٹ کی رائے میں اس بغاوت کا مشہور کردار بھائی مہاراج سنگھ تھا، جو اس بغاوت کے بانیوں یا امداد کرنے والوں میں سے تھا۔۲۰

اس میں کوئی شک کہ برطانوی راج کے خلاف سکھوں نے بحیثیت قوم بغاوت کیا تھا اور اس بغاوت کے پیچھے حاکم جموں و کشمیر گلاب سنگھ کا ہاتھ تھا یہ ایک فطری بات ہے کہ جس سے منصب چھینی جائے وہی پھر مزاحمت کرتا ہے۔ انگریز نے سکھوں سے پنجاب لے لیا اور پھر ہزارہ میں بھی آہستہ آہستہ ان کے اثرورسوخ کم کیا اور بالآخر ہزارہ پر بھی اپنی مکمل گرفت حاصل کی۔

میجر ایبٹ ہزارہ کا منتظم مقرر ہوا۔ اس نے نہایت چالاکی سے ہزارہ کے سرکش قبائلیوں اور دیہاتیوں کو رام کیا۔ چونکہ ہزارہ کے باسی سکھوں کے ساتھ مسلسل لڑائیوں میں مصروف رہے تھے اور ان لڑائیوں میں ان کو جانی نقصان بھی زیادہ اٹھانی پڑی تھی اس وجہ سے میجر ایبٹ نے سکھوں کے برخلاف افہام وتفہیم اور گفت وشنید سے کام لیا۔ اگرچہ انگریزوں کے خلاف بھی ہزارہ میں بغاوتیں ہوئی لیکن میجر ایبٹ نے مقامی روسا کو ساتھ ملا کر جرگہ سے بغاوت کو ختم کیا، یا پھر مقامی ہمدردوں کی مدد سے جو چھوٹے چھوٹے بغاوتیں ہوئیں ان کو کچل دیا۔ میجر ایبٹ نے یہاں سکھ دشمنی کا فائدہ اٹھایا اور اپنے آپ کو سکھوں کے دشمن اور مقامی لوگوں کا ہمدرد اور ساتھی ظاہر کیا جس کی وجہ سے مقامی لوگوں نے میجر ایبٹ کو رحمت خداوندی تصور کیا۔ اس وجہ سے سکون ہوا۔ اور میجر ایبٹ کے نام سے ایبٹ آباد شہر کا نام رکھا گیا۔ انگریز دور ایبٹ آباد کو خوب ترقی دی گئی۔ اس میں پکے سڑکیں سکول وہسپتال بنائے گئے۔ 1849ء میں ہزارہ کو دو تحصیلوں میں تقسیم کیا۔ یعنی تحصیل مانسہرہ اور تحصیل ہری پور اس وقت میں ضلع راولپنڈی کے 270 گاؤں بھی تحصیل ہری پور میں شامل کیے تھے۔ 1850ء میں مذکورہ بالا گاؤں ضلع راولپنڈی میں شامل کئے گئے۔ اسی طرح ضلع راولپنڈی میں شامل گاؤں اور تحصیل اٹک 1840ء میں تحصیل ہر پور میں شامل کئے گئے ۲۱ اسی سال تحصیل مانسہرہ کے جنوبی اور تحصیل ہر پور کے مشرقی حصے کو ملا کر تیسری تحصیل تحصیل ایبٹ آباد بنائی گئی۔ 1901 میں یہ علاقہ صوبہ پنجاب کا حصہ رہا لیکن اسی سال جب پنجاب کو تقسیم کر کے شمالی مغربی سرحدی صوبہ بنایا گیا تو ضلع ہزارہ کو اس نئے صوبے (صوبہ سرحد) میں شامل کر دیا گیا۔۲۲ اسی طرح ہزارہ کو تین

مشہور حصوں میں تقسیم کیا گیا جو کہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ تخت ہزارہ

اس تحصیل میں تحصیل مانسہرہ اور تحصیل ایبٹ آباد کو شامل سمجھا جاتا تھا۔

۲۔ میدان ہزارہ

تحصیل ہری پور کو پہلے ہی ہزارہ کہا جاتا تھا۔ مانسہرہ اور ایبٹ آباد کے جغرافائی حدود اگرچہ ہری پور سے ملتے تھے۔لیکن وہ ہزارہ میں شمار نہیں ہوتے تھے بعد میں ایبٹ آباد اور مانسہرہ بھی ہزارہ میں شامل کئے گئے۔ جو اب تک ہے۔

۳۔ چھچھ ہزارہ

اس حصہ میں حسن ابدال کے علاوہ حضرو سے اٹک تک کا علاقہ شامل تھا شروع میں یہ علاقہ ہزارہ کا سمجھا جاتا تھا مگر 1901 میں انگریزوں نے انتظامی اور سیاسی ضرورت کے تحت اسے پنجاب سے الگ کر کے صوبہ سرحد میں شامل کر دیا تھا۔[۲۳]

پاکستان بننے کے بعد حکومت پاکستان نے 77-1976 میں کوہستان کے علاقے کو ضلع کا درجہ دے کر ہزارہ کے ساتھ شامل کر دیا بعد میں ہری پور، ایبٹ آباد اور مانسہرہ بھی الگ الگ ضلع بنائے گئے۔ جبکہ اس سے قبل یہ تینوں تحصیلیں ایک ضلع کا حصہ تھیں۔ جو ضلع ہزارہ کہلاتا تھا۔ 1990ء کی دہائی میں ایک اور ضلع بنایا گیا جو کہ ضلع بٹگرام کہلایا۔ علاقہ اگرچہ پہلے سے ضلع ہزارہ کے حدود میں شامل تھا لیکن بعد میں الگ ضلع بنا دیا گیا۔ اب موجودہ ہزارہ پانچ اضلاع پر مشتمل ہے جو کہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ ضلع مانسہرہ

۲۔ ضلع ایبٹ آباد

۳۔ ضلع ہری پور

۴۔ ضلع بٹگرام

۵۔ ضلع کوہستان

اگر ہم ضلع مانسہرہ کو ہزارہ کا مرکز تصور کریں تو اس کا محل وقوع کچھ یوں بنے گا۔ کہ مانسہرہ کے شمال میں ضلع بٹگرام اور ضلع کوہستان واقع ہیں جن کے حدود گلگت سے ملتی ہیں جبکہ مشرقی جانب آزاد کشمیر کا ضلع مظفر آباد اور ضلع نیلم واقع ہیں۔ دریائے جہلم، دریائے کنہار اور شمالی جانب کے پہاڑی سلسلے ہزارہ کو کشمیر سے جدا کرتے ہیں۔اسی طرح مانسہرہ کے جنوب کی طرف ایبٹ آباد اور ہری پور کے اضلاع ہیں ان اضلاع کے حدود اٹک اور راولپنڈی سے جا کے ملتی ہیں۔ اس طرح مغربی جانب علاقائی حدود شانگلہ سوات ،صوابی اور بنیر سے ملتی ہیں۔ ہزارہ دریائے سندھ کی مشرقی جانب واقع ہیں۔ شاہراہ قراقرم ان پانچوں اضلاع کا سینہ پھاڑ کر یہاں سے گذرتی ہوئی چین تک جاتی ہے۔ ہزارہ کا کل رقبہ 17099 کلومیٹر ہے اور اسکی آبادی 2017 کی مردم شماری کے مطابق 5 ملین ہے۔

وسطی ایشیا اور جنوبی ایشیا ہزارہ میں آ کر ملتے ہیں۔ ہزارہ کے میدانوں میں میدان پکھل سب سے بڑا اور وسیع میدان ہے۔ جو کہ سطح سمندر سے 3000 فٹ بلند ہے[۲۴]۔ اس کے علاوہ ہزارہ میں کئی چھوٹی بڑی وادیاں اور دریا پائے جائے ہیں۔ گوجر، سواتی، پختون ،تنولی اور سید یہاں کے بڑے اقوام ہیں جبکہ ہندکو، پشتو اور گجری اہم علاقائی زبانیں ہیں۔ ہزارہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے جو کل آبادی کا 98 فیصد ہے[۲۵]۔ مسلک کے لحاظ اہلسنت کی اکثریت ہے جس میں ذیلی فرقے بھی پائے جاتے ہیں۔ یہاں رابطے کی زبان اردو ہی ہے۔ کوہستان میں بولی جانی والی زبان دوسری زبانوں سے بہت مختلف ہے۔ ضلع مانسہرہ ایبٹ آباد اور ہری پوری میں زیادہ تر ہندکو زبان بولی جاتی ہے۔ جبکہ ضلع بٹ گرام اور مانسہرہ کے اکثر علاقوں میں پشتو زبان بولی جاتی ہے۔ اس میں ہندکو زبان بولنے بھی مل جاتے ہیں۔ ہزارہ کی ثقافت پاکستان جیسا ہے کلچر و ثقافت کے لحاظ یہ پٹھانوں کے زیادہ قریب ہے تاہم کچھ اقدار و روایات اس کی ایسی ہے جو اسے دوسرے تہذیبوں سے منفرد اور جدا کرتی ہے۔

ب۔ ناول کا تاریخی شعور اور اصل تاریخی بیانیہ

جاگے ہیں خواب میں ایک کثیر الموضوعاتی ناول ہے اس ناول کو پڑھ کر قاری کو ہزارہ ڈویژن کی تاریخ و تہذیب سے آگاہی ہو جاتی ہے۔ اس ناول میں تاریخ و تہذیب کے علاوہ سائنس، فلسفہ، نفسیات، طبیعات، مابعدالطبیعات اور علاقے میں موجود توہمات اساطیر کی عمدہ تصویر پیش کی گئی ہے۔ اصل میں یہ کہانی 2005ء سے شروع ہوتی ہے۔ جب اس ناول کا مرکزی کردار زمان جو عزیز خان کا بیٹا ہے۔

کومے میں چلا جاتا ہے۔ اور کومے کے دوران اڑھائی ہزار سال پیچھے تاریخ میں سفر کرتا ہے۔ کبھی تو میدان جنگ میں ہوتا ہے۔ جہاں اپنے پردادا کے روپ میں سید احمد بریلوی کے ساتھ میدان جنگ میں سکھوں کے خلاف لڑتا ہے۔ تو کبھی اپنے دوسرے دادا ظفر علی خان کے روپ میں ڈھلتا ہے۔ جب وہ ایک بچہ ہوتا ہے اور لوگ اس کو ملبے سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر آخر کار یہ اشوک اعظم کے دور میں چلا جاتا ہے اور اشوک کے حکم پر چٹانوں پر عبارت کندہ کراتے ہیں۔ جب زمان کومے کے دوران پیچھے تاریخ میں سفر کرتا ہے تو قاری کو ہزارہ تاریخی واقعات سے آگاہی ہو جاتی ہے۔ جاگے ہیں خواب میں ایک بالکل مختلف ناول ہے۔ اسد محمد خان اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> جاگے ہیں خواب میں'' کا لوکیل (Locale) ہمارے ہاں عام طور پر لکھے جانے والے ناولوں سے مختلف ہے۔ کہیں دریائے کنہار کے کنارے آباد بالاکوٹ جیسا تاریخی شہر سانس لیتا محسوس ہوتا ہے تو کہیں دریائے ہرو اور اس کی معاون ندیاں اپنی جولانیاں دکھاتی ہیں، کہیں پہاڑ ہیں تو کہیں غار۔ اس حیران کن طلسمی ماحول میں ایک کہانی جنم لیتی ہے اور قدیم قصوں اور تاریخی حوالوں کو ساتھ لیے ایک وارفتگی کے ساتھ آگے بڑھتی کتنے ہی موڑ لیتی، حوصلہ مندی کے ساتھ اختتام کو پہنچتی ہے۔ خواب دیکھنے اور بیداری اور کشمکش میں زندگی کرنے والے کئی دل آویز کرداروں کی یہ کہانی پڑھنے والے کو جگائے رکھتی ہے۔ جو کسی بھی تحریر کی کامیابی کی دلیل ہے۔ ۲۶

اشوکِ اعظم کا دور

اختر رضا سلیمی نے ناول میں اشوکِ اعظم کے دور کا نقشہ بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے ۔ یہ دور ۲۳۲ ق م تا ۲۷۳ ق م تک کا ہے۔ اشوک موریہ سلطنت کا تیسرا حکمران تھا۔ اس خاندان کا سب سے طاقتور راجہ تھا۔ ٹیکسلا اور اس کے اردگرد کے علاقوں کا جوانی میں گورنر رہا۔ جب یہ گورنر تھا تو اس زمانے سے اس کے دل میں کلنگ (اڑیسہ) کو فتح کرنے کی خواہش تھی اور وہ اس کا اظہار بھی کیا کرتا تھا۔ اڑیسہ فتح کرنے کی خواہش کی وجہ یہ تھی کہ یہ اس وقت ہندوستان کی وہ واحد سلطنت تھی جو آزاد و خود مختار تھی اور موریہ دارالسلطنت کے تابع نہیں تھی۔ باپ کی وفات کے بعد جب اشوک بادشاہ بنا تو اس نے اپنے ایک بھائی کو

چھوڑ کر باقی ننانوے (۹۹) بھائیوں کو قتل کروا دیا۔ بادشاہ بنتے ہی اس نے اڑیسہ پر حملوں کا آغاز کیا۔ تین سال کی سخت ترین لڑائی کے بعد جب اس نے اڑیسہ کو فتح کیا تو وہاں لاکھوں لوگوں کا قتل عام کیا۔ جب اس نے یوں لاکھوں لوگوں کو مرتے کٹتے دیکھا تو اس کے دل میں رحم آیا اور اپنے زمانے کے اس نئے مذہب جو بدھ مت کے نام سے مشہور ہوا کی طرف مائل ہوا۔ اس جھکاؤ کی وجہ مذہب کی جڑ میں موجود عدم تشدد کا تصور تھا۔ اس تصور کی بنا پر ایک انسان تو کیا ایک کیڑے کو بھی مارنے کی اجازت نہیں تھی۔

اشوک اعظم نے جب بدھ مت قبول کیا تو اس کی زندگی میں انقلابی تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں اس نے پورے برصغیر میں بدھ مت کی تعلیمات کے پرچار کے لیے بھکشوؤں کو بھیجا۔ عبادت خانے تعمیر کروائے، کنویں کھدوائے، عوامی شاہراہوں پر سایہ دار درخت لگوائے، جگہ جگہ سرائے بنائے۔ سلطنت نے دن دوگنی رات چوگنی ترقی کی۔ بدھ مت کو سرکاری مذہب قرار دیا۔ ہر مذہب کا ایک سنہری دور ہوتا ہے اور بدھ مت کا سنہری دور اشوک اعظم کے دور حکومت میں رہا۔ اس دوران کافی حد تک یہ کوشش کی گئی کہ گوتم بدھ کی تعلیمات کو عام کیا جائے اور پر عمل کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے اشوک نے ۱۴ فرمان جاری کئے اور پورے ہندوستان میں جگہ جگہ یہ فرامین کندہ کروائے گئے جن میں لوگوں کو پرامن رہنے، ایک دوسرے سے محبت کرنے، دل کو صاف رکھنے اور اسی طرح دوسری اہم ہدایات دی گئی تھیں۔ اختر رضا سلیمی نے ناول میں اشوک اعظم کے فرامین کا ذکر کیا اور اس کچھ یوں بیان کیا:

> یہ مقدس فرمان مہاراجہ اشوک کے حکم سے جاری کیا گیا ہے۔ مہاراجہ کی خواہش ہے کہ ہر جگہ ہر طبقے کے لوگ اطاعت گزار رہیں، کیوں کہ ہر کوئی چاہتا ہے کہ وہ اپنے حواس قابو میں رکھے اور اس کا ذہن پاک صاف رہے۔ البتہ مردوں کو اپنی خواہشات اور پسند پر قابو نہیں رہتا۔ کچھ لوگ احکامات پر پورا عمل کریں گے اور کچھ جزوی طور پر، حتیٰ کہ کسی ایسے شخص کے نزدیک بھی جو مکمل طور پر آزادہ روی کا قائل ہو، اپنے حواس کو قابو رکھنا، ذہنی پاکیزگی، احسان مندی اور وفاداری ہمیشہ قابل تعریف رہی ہیں۔ ۲۷

مورخین کے مطابق اشوک اعظم کے حکم پر چٹانوں پر کندہ کرائے گئے کتبوں کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ لیکن امتدادِ زمانہ سے صرف ۴۲ کتبے ہی بچے ہیں۔ مذکورہ بالا فرمان کے بارے میں اختر رضا سلیمی

نے ناول میں لکھا ہے کہ یہ مہاراجہ اشوک کا ساتوان فرمان ہے۔ لکھتے ہیں:

> یہ مہاراجہ اشوک کا ساتواں فرمان ہے۔ اس نے اپنے دور حکومت میں کئی فرمان کندہ کرائے۔ جن میں سے چودہ فرمان مانسہرہ میں بریڑی کے مقام پر دریافت ہو چکے ہیں۔ یقیناً ایسے فرمان یہاں اور چٹانوں پر بھی موجود ہوں گے۔۲۸

اشوک اعظم نے اپنا نام ہریا درشی یا خدا کا دوست رکھااور اپنی اولاد کو بھی بدھ مت کے پرچار اور تبلیغ کے لئے وقف کر دیا۔ ایک اہم کارنامہ جو اس نے اپنے دور حکومت میں سرانجام دیا وہ یہ تھا کہ اس نے بدھ مت کی تیسری بڑی مجلس ۲۴۲ ق م میں منعقد کروائی۔ اور اس مجلس میں بدھ مذہب کے ہزاروں علماء کو جمع کیا تا کہ بدھ مت کو اس کے بانی یعنی گوتم بدھ کی تعلیمات کے مطابق اور اس کی اصل شکل میں دریافت کیا جا سکے کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں کافی تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں۔ اشوک چاہتا تھا کہ بدھ کہ بدھ مت کو اپنی اصل شکل میں بحال کیا جائے۔ یہ مجلس پاٹلی پتر میں منعقد ہوئی۔ اس اجلاس میں بدھ مت کے جتنے بھی احکام، حکایتیں اور روایات تھیں اس کو پالی زبان میں لکھ کر محفوظ کیا گیا۔ ڈھائی ہزار سال سے بدھ مت کے جو شاستر جنوبی ایشیا میں جاری ہیں یہ وہی ہے جو اشوک نے بدھ مت علماء کا اجلاس بلا کر مرتب کیا تھا۔۲۳۲ ق م میں اشوک اعظم نے وفات پائی اور اس کے چالیس سال بعد موریہ خاندان کا بھی خاتمہ ہوا۔

اختر رضا سلیمی ناول میں گندھارا تہذیب کا ذکر تمدنی و تہذیبی عروج کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ اور زیادہ تر ناول میں گندھارا کے ان دو پہلوؤں پر گفتگو ہوئی ہے اس وجہ سے راقم نے فیصلہ کیا کہ گندھارا تہذیب کے اہم ستون کا ذکر جو ناول میں موجود ہے اس کا ذکر مقالے کے تہذیب والے باب میں کیا گیا ہے۔

اس ناول میں سید احمد بریلوی کی تاریخ سے بھی قاری کا واسطہ پڑھتا ہے۔ کہ کس طرح سید احمد نے سکھوں کے ساتھ جنگ کیا اور پھر ان کو کیوں شکست ہوئی۔ ناول سے ظاہر ہے کہ قبیلے نے سید احمد بریلوی کے تعلیمات سے متاثر ہو کر ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ناول میں اختر رضا سلیمی لکھتے ہیں۔

> ابھی چند مہینے پیشتر ان کے قبیلے کے سردار کو خبر ملی کہ سید احمد بریلوی ایک قریبی

> علاقے بھوگڑ منگ میں قیام پذیر ہیں۔ اس نے ان دونوں (نور خان عبداللہ خان) کو اپنا نائب بنا کر بھیجا وہ سید احمد بریلوی اور ان کے مرید خاص کے تعلیمات سے بہت متاثر ہوئے۔ واپس آ کر انھوں نے سید صاحب کا خصوصی پیغام اپنے قبیلے کے سربراہ تک پہنچایا۔ قبیلے کے سربراہ نے اگلے ہی ہفتے سید صاحب سے ملاقات اور پورے قبیلے کی طرف سے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ ۲۹

سید احمد بریلوی کا طریقہ یہ تھا کہ جو قبیلہ اطاعت پر راضی ہوتا۔ اس قبیلے کو اسلامی ریاست کے اندر شمار کرتے اور ان پر مذہبی قوانین کا اطلاق ہوتا۔ اس حوالے سے اختر رضا سلیمی لکھتے ہیں۔

> واپسی پر جب اس نے (سردار) اپنا فیصلہ قبیلے کے سامنے رکھا تو کسی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی۔ جن لوگوں کو اس سے اختلاف تھا۔ انھوں نے بھی یہ کہہ کر اب قبیلے کی غیرت کا مسئلہ ہے ساتھ دینے کا عزم کیا۔ ''یہاں تک کہ ان کے آباؤ اجداد صدیوں سے جس طریقے سے نماز ادا کرتے چلے آ رہے تھے اس میں بھی تبدیلی لا کر انھوں نے اپنے آپ کو سید احمد بریلوی کے مسلک سے ہم آہنگ کر لیا البتہ شادی بیاہ اور مرگ و موت کے رسومات، جنھیں سید احمد بریلوی غیر اسلامی قرار دیتے تھے۔ انھوں نے برقرار رکھیں۔ شاید اس معاملے میں عقائد نے ثقافت اور رسوم و رواج کے آگے ہتھیار ڈالے دیئے تھے'' ۳۰

ناول سے ظاہر ہے کہ کسی علاقے کا تہذیب و ثقافت جو ہزاروں سالوں سے اس معاشرے میں پروان چڑھا ہوں۔ لوگ اس کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ سید احمد بریلوی سے یہ غلطی پشاور میں ہوئی کہ اس نے پٹھانوں کے روایت کو ختم کیا جو وہ سینکڑوں برسوں سے کرتے چلے آ رہے تھے۔ اس وجہ سے ان قبیلوں نے بغاوت کیا۔ سید احمد بریلوی کی تحریک کے سپاہیوں کو مارا اور سید صاحب کو ہزارہ آنا پڑا۔ اس بارے میں اختر رضا سلیمی لکھتے ہیں۔

> سید احمد بریلوی نے جب دیکھا کہ ان کا پورا قبیلہ ظاہری طور پر ہی سہی ان کا ہم خیال ہو چکا ہے تو انھوں نے چھوٹے موٹے فروعی مسائل کو نظر انداز کیا۔

بہت سی دیگر وجوہات کے علاوہ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ سید صاحب پشاور میں مقامی رسوم و رواج کو ختم کرنے کا انجام دیکھ چکے تھے۔ اس سے پہلے پشاور میں جہاں انھوں نے کچھ عرصہ اپنی حکمرانی قائم کیے رکھی تھی۔ ان کا سب سے بڑا حمایتی ایک ایسا قبیلہ تھا، جس میں صدیوں سے رسم و رواج چلا آرہا تھا کہ کوئی لڑکی جوان ہوتی تو اس کا رشتہ اس کے ہم کفو سے طے کر دیا جاتا لیکن جب اس کا منگیتر ایک سو اسی روپے کما کر لڑکی والوں کو ادا نہ کرتا اس کی شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ سید احمد بریلوی نے اس رسم کو بدعت قرار دے کر حکم جاری کیا۔ کہ جو شخص لڑکی کا شیر بہا لے گا حرام کھائے گا۔ انھوں نے فرمان جاری کر دیا کہ تمام نامزد شوہر نکاح پڑھانے والے کو صرف پانچ آنے ادا کر کے اپنی نامزد بیویاں اپنے گھر لے آئیں۔

''اس حکم کے جاری ہوتے ہی عام لوگ بالخصوص جوانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ سینکڑوں لڑکیاں جن کی منگنی ہو چکی تھی لیکن شیر بہا ادا نہ کرنے کی وجہ سے اپنے والدین کی گھروں میں بیٹھی ہوتی تھیں۔ ان کے نامزد شوہر پانچ پانچ آنے نکاح خوانوں کو ادا کر کے انھیں اپنے اپنے گھروں میں لے آئے۔ اگرچہ یہ ایک نیک اور غریبوں کے لئے فائدہ مند کام تھا، لیکن ایسے ہی رواج رکھنے والے دوسرے قبائل نے اس قبیلے کو طعنے دینا شروع کر دیئے کہ ان کی لڑکیوں کی قیمت اب صرف پانچ آنے رہ گئی ہے۔ یہ طعنہ مذکورہ قبیلے کو بہت برا لگا اور اس کے عمائدین نے آپس میں مشورہ کر کے سید احمد بریلوی کے خلاف بغاوت کر دی۔ جو ان کے حکومت کے خاتمے پر منتج ہوئی۔[۳۱]

جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ سید احمد بریلوی مسلمانوں کے دور زوال میں اٹھے تھے۔ ان کا بڑا مقصد مسلمانوں کو دوبارہ اکٹھا کر کے ہندوستان میں ایک مسلم ریاست کی بنیاد رکھنی تھی۔

ڈاکٹر نذر عابد اپنے مضمون ''ناول جاگے ہیں خواب میں'' کا تجزیاتی مطالعہ (سید احمد شہید کی تحریک جہاد کے خصوصی تناظر میں) میں لکھتا ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز میں اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد برصغیر میں مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ مختلف علاقوں میں مقامی حکمرانوں نے اپنی آزاد ریاستیں قائم کرلیں۔ حکومتی سطح پر مرکزیت کے خاتمے نے سیاسی، سماجی اور اقتصادی انتشار کو جنم دیا۔ نتیجے کے طور پر نصف صدی کے اندر اندر برصغیر کا سیاسی، سماجی، اور اقتصادی ڈھانچہ تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔[۳۲]

اس وجہ سے پورے ہندوستان میں جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی تحریکیں شروع ہوئیں کہ مسلمانوں کو دوبارہ ہندوستان میں مضبوط کیا جائے۔ سید احمد بریلوی کی تحریک ایک ہمہ گیر تحریک تھی، اور ان کا مقصد مذہبی احکامات کا نفاذ اور ہندوستان میں اسلامی ریاست کا قیام تھا۔ اختر رضا سلیمی ناول میں لکھتا ہے۔

''نماز کے طریقوں میں معمولی تبدیلی کے علاوہ ایک اور اہم تبدیلی جو ان کی زندگیوں میں رونما ہوئی تھی وہ ایک مسلم سلطنت کے قیام کا خواب تھا۔ اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لئے وہ ہر قربانی دینے کو تیار تھے۔ انھیں یقین تھا کہ وہ بہت جلد اس کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے'' [۳۳]

سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد کی ناکامی کے اور بھی بہت سارے وجوہات تھے۔ ڈاکٹر مبارک علی نے اپنی کتاب المیہ تاریخ میں اس تحریک کے حوالے سے لکھا ہے۔

سید احمد بریلوی کے دعوی امامت نے صرف سرحد میں ان کی مخالفت کو ابھارا، بلکہ میں ہندوستان میں بھی ان کے دعوے کو شک و شبہ سے دیکھا گیا جب خطے میں ان کا نام بحثیت خلیفہ اور امام پڑھا گیا تو سرحد کے سرداروں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ ان کے علاقے اپنی حکومت قائم کر کے انہیں اقتدار اور سرداری سے محروم کرنا چاہتا ہے۔[۳۴]

سرحد کے پٹھان سردار ہندوستان سے آنے والے لوگوں کو کسی صورت حکمران تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ سید صاحب نے مختلف علاقوں میں جو قاضی مقرر کئے تھے وہ معمولی معمولی باتوں پر لوگوں کو سخت سزائیں دینے لگے۔ اور مقامی کلچر و روایت کو کافرانہ قرار دیتے رہے۔ جس کی وجہ سے لوگوں میں

اشتعال پھیل گیا۔ شیخ محمد اکرام لکھتا ہے۔

> اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سید صاحب کے بعض ساتھیوں کا رویہ ہمدردی اور معاملہ فہمی کا نہ تھا بلکہ وہ جلد ہی فاتحانہ تشدد پر اتر آتے۔ ایک موقع پر جب مذکورہ جماعت ومجاہدین) کے ایک قائد قاضی سید محمد جہاں کے اس ارشاد پر کہ جو اہل رسوم خدا اور رسولؐ کے حکم کے خلاف باپ دادا کے ریت پر چلتے ہیں وہ عملاً کافر ہیں۔ کسی نے کہہ دیا کہ مینہ المصلی میں اہل رسوم کو کافر نہیں کہا گیا تو اس کا جواب گھونسوں سے دیا گیا اور قائد موصوف نے اس وقت تک معترض کو چھوڑا جب تک اس نے دوبارہ کلمہ نہ پڑھ لیا''۶؎

صوبہ سرحد کے خواتین نے عشر دینے سے بھی انکار کیا۔ اور وہاں کے علماء نے بھی ساتھ دیا کیوں کہ یہ عشر پہلے ان علماء کو ملا کرتا تھا، اب ان کی روزی روٹی بند ہوگئی۔ جس کی وجہ سے انہوں نے بھی مخالفت کا ایک ماحول بنایا۔ مکتوبات سید احمد میں لکھا ہے۔

> جس چیز نے سرحد کے علماء کو ناراض کیا وہ سید احمد اور مجاہدین کا عشر وصول کرنا تھا کیونکہ اس کا حقدار امام ہوتا ہے اور وہ اسے بیت المال میں جمع کر کے مستحقین میں تقسیم کرتا تھا، چونکہ اس سے سرحد کے علماء کی روزی پر اثر پڑا، اس لئے وہ ان کے زبردست مخالفت ہو گئے۔ مخالفت بعد میں ان کے عقائد کی وجہ سے اور بڑھ گئی چونکہ امین بالجہر (زور سے امین کہنا) اور رفع یدین (نماز میں ہاتھ اٹھانا) ان کے عقائد میں شامل تھے۔۳۵؎

ایک تو جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ اس تحریک کا بڑا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں بڑی ریاست کو قیام میں لایا جائے۔ اس وجہ سے سید صاحب بجائے اس کے کہ ہندوستان کے وسط میں بیٹھ کر تحریک کا آغاز کرتے اس نے شمالی مغربی سرحدی علاقے کا انتخاب کیا۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ سرحد کے پٹھان زیادہ مذہبی تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ سرحد سے ہی مغرب کی طرف اسلامی ممالک کا ایک سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ جس کو وسطی ایشیا کہا جاتا ہے۔ سید احمد بریلوی کو جب پشاور میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو اس نے ہزارہ کے طرف رخ کیا جہاں سکھوں کی حکومت تھی۔ ہزارہ میں سکھ حکومت اگرچہ مستحکم تھی لیکن ہزارہ کے قبائل

وقت بر وقت سکھ حکومت کے خلاف بغاوتیں کرتے تھے جو سکھ حکومت سختی سے کچلتی تھی۔ جب راجہ نے قبیلے کے سربراہ سے ہتک آمیز سلوک کیا تو قبیلے کے سربراہ نے عزم کیا کہ وہ اس سلوک کا بدلہ لے گے۔ اختر رضا سلیمی اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

جب سکھ شاہی آغاز ہوئی تھی اور ان کی ریاست کے راجہ سمیت اردگرد کی بیشتر ریاستوں کے سربراہان نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت قبول کر لی تھی، ان کی ریاست کے راجہ نے امر سنگھ مجیٹھ کو، جیسے رنجیت سنگھ نے ہزارہ کا منتظم مقرر کیا تھا ان کے چھوٹے سے قبیلے کے خلاف یہ کہہ کر اکسایا کہ ہزارہ میں سکھ حکومت اس وقت تک مضبوط نہیں ہو سکتی، جب تک وہ اس سرکشی قبیلے کو تابع نہیں کر لیتی ۔ راجہ در پردہ اپنے دادا کے ہلاکت کا قرض چکانا چاہتا تھا۔ اس نے ان کے خلاف امر سنگھ کے کان خوب بھرے۔''

''طاقت کے نشے میں چور امر سنگھ نے فوراً اپنے درباری نجومی کو بلایا، اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا اور زائچہ بنانے کا حکم دیا۔ نجومی نے ایک رات کا وقت مانگا۔ اگلے صبح نجومی نے اسے بتایا کہ آپ مطمئن ہو کر حملہ کر دیں۔ زائچے کے مطابق آپ کی موت سمندر میں واقع ہو گی۔ وہ بہت خوش اور اس نے نجومی کا منہ نانک شاہی سکوں سے بھر دیا'' [۳۴]

اس سے اگلے دن ہری سنگھ نے مذکورہ قبیلے پر حملہ کر دیا، جو ظاہری بات ہے ریاست سے تو نہیں لڑ سکتی تھی، اس وجہ سے ہری سنگھ نے بغیر مزاحمت کے گاؤں کو فتح کیا مال مویشی اور گھروں میں پڑا سامان لوٹ کر گاؤں کو آگ لگایا۔ گاؤں کے لوگ پہلے ہی پہاڑوں کے طرف بھاگ گئے تھے۔ ہری سنگھ کو چونکہ اس کمزور قبیلے کی طرف سے جوابی حملہ کی بالکل توقع نہ تھی اس وجہ سے ہری سنگھ نے رات کو وہاں قیام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور جشن منانے کا اعلان کیا۔ سپاہیوں نے جی بھر کر جشن منایا لیکن پھر کیا ہوا اختر رضا سلیمی لکھتے ہیں۔

گاؤں ایک ندی کے کنارے اونچے پہاڑی پر واقع تھا۔ دوسرے دن صبح کے وقت وہ بول و بزار اور نہانے دھونے کے لئے ندی کے کنارے چلا گیا۔ جہاں اوپر پہاڑوں سے صاف و شفاف پانی آ رہا تھا۔

ہری سنگھ نے جب یہ منظر دیکھا تو اپنے حفاظت پر مامور ایک سپاہی کو حکم دیا کہ جا کر میرے بھائی کو بلائے۔ جب اس کے بھائی کو اطلاع دی گئی تو سمجھ گیا کہ مہاراجہ کو افیون کی طلب ہو رہی ہے۔ اس نے افیون ساتھ لی اور بھاگتا ہوا ندی کے کنارے پہنچ گیا۔ امر سنگھ نے جب افیون کی یومیہ مقدار لی اور اپنے حفاظتی دستے کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ ابھی وہ افیون سے سرور لے رہا تھا کہ بھائی نے اس کو کچھ گھڑسواروں کے طرف متوجہ کیا جو سروں پر کھڑے تھے۔ اختر رضا سلیمی اس واقع کو فکشنائز تذکرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> یہ عبداللہ خان ، نور خان اور احمد خان تھے ان تینوں نے ان دونوں بھائیوں کو گھیر لیا۔ امر سنگھ فوراً نے اپنی حفاظتی دستے کو آواز دی۔ دس سپاہیوں پر مشتمل اس دستے نے ان تینوں کو لیا اور دو بدو لڑائی شروع ہو گئی۔ احمد خان دادشجاعت دیتے ہوئے زخمی ہو کر اپنے گھوڑے سے نیچے گر پڑا۔ جوں ہی احمد خان گھوڑے سے گرا۔ نور خان کے آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے سپاہیوں کو چھوڑ کر امر سنگھ پر حملہ کردیا اور اگلے چند لمحوں میں ان کا سرتن سے جد کر دیا۔اس دوران عبداللہ خان امر سنگھ کے بھائی کا کام بھی تمام کر چکا تھا۔ پھر وہ دونوں سپاہیوں کی طرف پلٹے، سپاہیوں نے جو اپنے سردار اور اس کے بھائی کا انجام دیکھ چکے تھے بھاگنے میں ہی عافیت سمجھی وہ دونوں سپاہیوں کا پیچھے کرنے کے بجائے احمد خان کی طرف لپکے، جو اُن کے پہنچنے سے قبل دم توڑ چکا تھا۔
>
> امر سنگھ اور اس کے بھائی کی لاشیں ایک ماہ سے زائد عرصے تک ندی کے کنارے پڑی گلتی سڑتیں رہیں، آخر کار علاقے کے ہندوؤں اور برہمنوں کا ایک وفد قبیلے کے سربراہ کے پاس آیا اور لاشیں ورثاء کے حوالے کرنے کی درخواست کی۔ جنھیں سرائے صالح لے جا کر جلایا گیا اور ان کے سمادھی بنا دی گئی۔۳۵

ہزارہ کے حوالے سے اولین کتاب مہتاب سنگھ کی ہے جس کا نام تاریخ ہزارہ و عہد سرکار انگریزی ہے یہ کتاب فارسی میں ہے۔ اور انگریزوں کے دور میں لکھی جا چکی ہے۔ ڈاکٹر خان بہادر اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

جب پنجاب پر انگریز قابض ہوئے اور میجر چیمبرلین ہزارہ پہنچا تو اس نے مہتاب سنگھ سے کہا کہ تم تیس برس ملک میں گزار چکے ہو۔ اگر اس ملک کے چشم دید حالات کتاب کے مشکل میں مرتب کردو تو وہ کتاب تمہاری یادگار ہے گی اور یہ امر ہماری خوشنودی کا باعث ہوگا۔ ۳۶

ڈاکٹر صاحب آگے لکھتے ہیں۔

یہ کتاب اس زمانہ کے چشم دید حالات و تفصیل پر مبنی ہے۔ اس کی عبارت مسجع و مقفیٰ فقرات سے بھری ہوئی ہے۔ کہیں کہیں عربی ضرب المثال اور عموماً فارسی المثال و ابیات ہیں اور اس زمانے کے عادت کے مطابق عبارت طول طویل ہے مگر میں نے اس کتاب کے مطالب کو ہی مختصر الفاظ میں ترجمہ کر دیا ہے۔ ۳۷

اس کتاب میں ہزارہ کے بارے میں بہت معلومات ملتی ہے۔ ہزارہ کا محل وقوع، سکھ حکومت کے اقدامات ہزارہ پر دورانیوں کے حملے، سید احمد بریلوی اور سکھوں کے درمیان جنگ، ہزارہ کے مختلف اقوام اور ان میں پیدا ہونے فصلیں جیسے اہم معلومات ہمیں اس تاریخ سے ملتی ہے۔ ڈاکٹر خان بہادر پنی نے فارسی زبان سے اردو زبان میں اس کا ترجمہ کیا ہے اور اپنی تاریخی کتاب تاریخ ہزارہ میں اس کو شامل کیا ہے۔ مہتاب سنگھ نے امر سنگھ کے قتل کا واقعہ اپنی تاریخ میں بیان کی ہے۔ جس کو سلیمی صاحب نے ناول کا حصہ بنا کر خوبصورت انداز سے فکشنا تذ کیا ہے۔ مہتاب سنگھ اس واقع کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

تو سردار موصوف اپنے چند سواروں کے ساتھ وادی سمند اکٹھ جو موضع بجی کوٹ نگری و مکول کے نیچے واقع ہے۔ طہارت کے لئے نیچے اُترا۔ یومیہ مقدار کھانے اور پاخانہ وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد گھوڑے پر سوار پر ہوا تو قرب و جوار کے ملکی لوگ سمندر لال، ڈھونڈ و چوکیالی تینوں قوموں کے افراد شوروغوغا کرتے ہوئے ڈھول وتری کے ساتھ مقابلے پر آن کھڑے ہوئے اور سردار مذکور کو وادی سمندر کٹھ میں گھیر لیا۔ اس وقت وہ کٹھ میں جاری پانی سے ہاتھ دھو رہا تھا۔ چنانچہ سردار موصوف نے اپنی ملازم فوج اور حشری کو واپس

> آنے کے لیے آواز دی لیکن کوئی بھی واپس نہ آیا کہ مدد کرے۔ سردار نے اپنی کمان سنبھالی کہ دشمنوں پر تیر اندازی کرے۔ لیکن تینوں بار زہ کمان سے اتر گئی۔ لاچار سردار نے کمال بہادری اور سرخروئی سے بمعہ اپنے چھوٹے بھائی ہری سنگھ نے از دست دشمنان جان دے دی۔ ان دونوں بھائیوں کی لاشیں سمندر کھڈ کے پانی کے کنارے ایک ماہ سے زائد پڑی رہیں۔ آخرکار ہندوؤں اور برہمنوں کی درخواست پر یہ لاشیں سرائے صالح لے جا کر جلائی گئیں۔ اور سمادھی بنادی گئی۔ اب تک وہ دیری موجود ہے۔[۳۸]

سید احمد بریلوی جب ہزارہ چلے گئے تو وہاں لوگوں نے ان کا ساتھ دیا۔ خاص کر بالا کوٹ کے وہ دیہاتی اور قبائلی لوگ جو سکھ شاہی سے اپنا انتقام لینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ سکھوں سے لڑائیوں کے دوران ان کے لوگ مارے چکے تھے ان کے گھر بار لوٹے گئے اس وجہ سے انھوں نے جوق در جوق سید احمد بریلوی کے ہاتھ پر سکھوں کے خلاف جہاد کے لئے بیعت کیا۔ اختر رضا سلیمی اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

> اسی دوران میں سید احمد بریلوی نے موضع بالاکوٹ میں جا کر ڈیرے جما لیے۔ قیام بالاکوٹ کے دوران میں خطے کے وہ تمام لوگ جو سکھا شاہی کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ جوق درجوق آکر ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے اور اپنا مال و متاع ان کے قدموں میں ڈھیر کرنے لگے۔ جب اس کی اطلاع علاقے کے ناظم الامور مہاں سنگھ کو ملی؛ تو وہ فوراً کنور شیر سنگھ کی، جو رنجیت سنگھ کی ہزارہ میں مسلح افواج کا سربراہ تھا، خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی، خلیفہ مقامی لوگوں کو ہمارے خلاف اکسا رہا ہے اور ان سے مالیہ وصول کر رہا ہے۔ اگر وہی صورتحال رہی تو علاقے میں تعینات فوج کو تنخواہ دینا مشکل ہو جائے گی حملے کی صورت میں مقامی لوگ بھی اس کا ساتھ دیں گے۔ اگر بروقت اس کا تدراک نہ کیا گیا تو اس کے سنگین نتائج برآمد ہوں۔[۳۹]

کنور شیر سنگھ نے باقاعدہ جنگ کی تیاری شروع کی۔ وزیر سنگھ سادھو سنگھ اور نہتگ سنگھ کو بلا لیا۔ کنور شیر سنگھ نے ان تین جرنیلوں کو حکم دیا کہ وہ مع سپاہیوں کے یہاں سے گڑھی کے مقم پر دریائے کہنار کے

کنارے جا کر قیام کریں اور مہاں سنگھ جو حکم دیں اس پر عمل در آمد کرے۔ اختر رضا سلیمی صاحب لکھتے ہیں۔

''سردار مہاں سنگھ نے کہنار دریا گڑھی فتح سنگھ کے نام سے ایک گڑھی تیار کرنا شروع کر دی۔ تین دن بعد ابھی اس کی بنیاد ہی رکھی گئی تھی کہ ہر طرف یہ افواہ پھیل گئی کہ آج شام کو سید احمد بریلوی اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ دریا کے دوسرے کنارے ڈیرا جمائیں گئے۔ اور شب کے پچھلے پہر سکھوں کے ڈیرے پر شب خون ماریں گے۔ یہ خبر سنتے ہی سکھ فوج کے افسران گھبرا گئے۔ انھوں نے ڈیرے کے گرد خندق کھود کر خارجہ بندی شروع کر دی۔ رات بھر سید احمد بریلوی کی آمد کی افواہ سارے لشکر میں گردش کرتی رہی۔اردگرد کے جنگلوں میں جہاں کوئی سرسراہٹ ہوتی وہ چوکنے ہو جاتے۔ وہ رات بھر نقارے تھارے پیٹتے رہے اور گھوڑوں پر سوار ادھر ادھر گھومتے رہے۔ دوسرے دن انھوں نے کنور شیر سنگھ کو عرضی بھیجی۔ خلیفہ دریا کے پار آ چکا ہے۔ اس کے پاس میدانوں علاقوں سے آتے ہوئے تربیت یافتہ مسلح باغیوں کی ایک بھاری تعداد ہے۔ بہت سے مقامی لوگ بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔ آج رات وہ ہمارے ڈیرے پر شب خون مارے گا۔ ہمارے پاس صرف آٹھ سو سپاہی ہیں۔ جو کسی بھی صورت اس کا مقابلہ نہیں کر پائیں گئے۔ وہ ہم سب کو قتل کر دے گا۔ لہٰذا فوری طور پر فوج کی ایک بھاری نفری بھیجی جائے۔[۴۰]

جب ہم مہتاب سنگھ کی تاریخی ہزارہ دیکھتے ہیں تو یہ احساس بار بار ہوتا ہے کہ سلیمی صاحب نے تاریخ کو مسخ نہیں کیا ہے بلکہ جو کچھ تاریخ میں ہے اس کو ناول کے فن کے تقاضوں کے مطابق فکشنائز کیا ہے۔ اور مکالماتی انداز میں ناول کو آگے بڑھایا ہے اردو ادب میں اس سے پہلے بہت سارے تاریخی ناول لکھے جا چکے ہیں۔ جس میں نسیم حجازی اور عبدالحلیم شرر قابل ذکر ہے۔ ان دونوں نے تاریخی ناولوں میں بڑا نام پیدا کیا ہے اور مسلمانوں کی تاریخ کو فکشنائنز کرنے میں ان دونوں کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ لیکن ان دونوں کے ہاں قاری کو پڑھتے ہوئے یہ احساس بار بار ہوتا ہے کہ کردار حقیقی زندگی سے دور ہوتے ہیں اور عموماً وہ ایسے

کارنامے سرانجام دیتے ہیں۔ جو کہ ہمارے عام تجربے سے ماوراء ہوتے ہیں۔ ناول کا مطلب ہی یہی ہے کہ یہ انسانی زندگی کے قریب تر ہوں اس میں تخلیق کار کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ مثالی کرداروں سے بچنے کی کوشش کریں۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں ایسے مثالی کردار ہیں جو یا تو فرشتے ہیں یا پھر شیطان۔ حالانکہ کرداروں کو انسان ہونا چاہیے۔ چونکہ نذیر احمد اردو کے اولین ناول نگار ہے اس وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ کیونکہ ایک فن تمام خامیوں سے پاک خلاء میں پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر صنف اور فن پارہ ارتقائی دور سے گزرتا ہے ان پر جرح وتنقید ہوتی ہے اس کے بعد جا کے ایک معیاری فن پارہ تخلیق پاتا ہے۔ اور یہ سفر جاری رہتا ہے۔ ایسا نہیں ہیں کہ اب اردو میں جو ناول یا دوسرے اصناف لکھے جاتے ہیں وہ ہر لحاظ سے مکمل ہے ان پر بھی تنقید ہوتی ہے اور اس طرح ادب کا یہ سفر تا قیامت جاری رہے گا۔ سلیمی صاحب نے ہزارہ کی تاریخ کو مسخ نہیں کیا ہے بلکہ کرداروں کے ذریعے تاریخ کو زیادہ جاندار انداز میں پیش کیا ہے۔ سلیمی صاحب نے یہ عرضی بھیجنے والا واقع بھی مہتاب سنگھ کی تاریخی کتاب سے اٹھایا ہے۔ جس کو میں نقل کر رہا ہوں۔

> افسران نے مشورہ کر کے کنور شیر سنگھ کو عرضی بھیجی کہ خلیفہ دریا کے اس پار آ گیا ہے اور شب خون مارنے کا ارادہ کر رہا ہے اگر اس نے ایسا کیا تو ان کی قلیل جمعیت، آٹھ سو سپاہی مقابلہ نہ کر سکیں گے اور وہ ان سب کو قتل کر دے گا۔ یہ عرضی رات کو نہ پہنچی۔ کنور شیر سنگھ نے اسی وقت سب فوج کو حکم دے دیا کہ فوراً سوار ہو جاؤ۔ لیکن رات ہونے کی وجہ سے تیاری میں دیر ہو گئی۔ رات دو تین گھڑی سے گزر چکی تھی کہ تیاری شروع کی گئی لیکن فوج دو گھڑی رات باقی تھی کہ فوج سوار ہو کر گوجرہ سے روانہ ہو گئے اور گڑھی کی تعمیر شروع کر دی سولہ دن میں گڑھی تیار ہو گئی۔[۱۴]

مہتاب سنگھ نے گڑھی تعمیر کرنے کا واقع اور سکھ سپاہیوں کا حملہ کے خوف کی وجہ سے رات بھر جاگنے کا واقعہ کچھ اسی طرح بیان کیا ہے۔

> سردار مہاں سنگھ نے وہاں ایک گڑھی موسوم بہ فتح سنگھ گڑھی تعمیر کرنی شروع کر دی۔ وہ تین دن کے بعد یہ قلعہ کسی جگہ ایک گز اور کسی جگہ ڈیڑھ گز کے

> قریب تیار ہوا ہوگا کہ خبر ملی کہ آج چار گھڑی دن باقی ہوگا کہ خلیفہ بالاکوٹ سے چل کر دریا کے دوسرے کنارے پر بالمقابل آ گیا ہے اور آج رات سکھوں کے ڈیرہ پر شب خون مارے گا۔ یہ خبر سنتے ہی ڈیرہ کے افسر گھبرا گئے کہ ان کے ساتھ فوج تھوڑی ہے اور اس کا علاج کوئی نظر نہ آتا تھا۔ آخر کار جرأت کر کے انھوں نے اپنے ڈیرہ کے گرد خندق کھودی اور خار بندی کر لی۔ پتھر اور لکڑی جمع کر کے اپنے مورچے کے دونوں دروازوں کے پاس ڈھیر کر دی۔ چار گھڑی رات گزرنے کے بعد سب سوار اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر اور ہر پیادہ مسلح ہو کر کبھی مشرق اور کبھی شمال کی طرف جاتے۔ ڈھول ونقارہ صبح تک بجاتے رہتے۔ یہ زلزلہ اور شور ساری رات جاری رہا۔ کوئی کہتا کہ اس طرف سے آ گئے۔ کوئی کہتا کہ اس راہ سے آ گئے ساری رات خوف سے کوئی بھی سو نہ سکا۔[۴۲]

اگلے دن جنگ کی تیاری میں مزید تیزی آ گئی اور دونوں طرف سے خوب تیاری شروع ہو گئی۔ دونوں متحارب گروپ صلاح مشورے کر رہے تھے کہ کس طریقے سے دشمن پر حملہ کیا جائے۔ اس حوالے سے اختر رضا سلیمی لکھتے ہیں۔

> کنور شیر سنگھ نے بھی معاملے کی نزاکت کے پیش نظر وہاں جانا ضروری سمجھا اس نے گڑھی کا معائنہ کیا اور پھر دریا کے کنارے چلتا چلتا بالاکوٹ سے تین کوس کے فاصلے پر واقع کوٹ بھلہ کے مقام پر آ ٹھہرا۔ جہاں اس نے دور بین کے ذریعے سید احمد بریلوی کے پڑاؤ کا مشاہدہ کیا اور اپنی فوج کے سالاروں سے کہا؛ دریا کے اس کنڈے سے ان کے ڈیرے پر حملے کی صورت میں فتح مشکل ہے۔ کوئی اور صورت نکالنا پڑے گی۔ اگلے کئی دن تک اس حملے کے سلسلے میں صلاح مشورے ہوتے رہے۔[۴۳]

سید احمد بریلوی اور ان کے مجاہدین بھی معاملے پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اور وہ بھی مختلف جنگی چال چل رہے تھے۔ انھوں نے سکھوں کی فوج کو دھوکہ دینے کے لئے جو جنگی چال چلی۔ اس حوالے سے اختر رضا سلیمی لکھتے ہیں۔

سید احمد بریلوی اور ان کے ساتھی بھی اس معاملے پر بدستور نظر رکھے ہوئے تھے۔ ایک رات انھوں نے اپنے پانچ سو مسلح افراد کو دریا عبور کر کے وہاں سے تقریباً دو کوس کے فاصلے پر واقع جنگل میں چھپا دیااور صبح سویرے ڈیرے پر چاول پکا کر کھلے برتنوں میں چھوڑ دیئے۔ اور خود بھی اپنے باقی ساتھیوں سمیت وہاں سے غائب ہو گئے۔ شام کے وقت کنور شیر سنگھ نے دور بین لگا کر دیکھا تو پڑاؤ کی جگہ ہر طرف پرندے اڑتے پھر رہے اور وہاں کسی آدمی کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ لگتا ہے خلیفہ بھاگ گیا ہے۔ کسی انسان کی موجودگی میں پرندے یوں بے خوف وخطر برتنوں سے رزق نہیں چگ سکتے۔ بہر حال اصل صورتحال معلوم کرنے کے لئے پانچ مسلح لوگوں کو فوراً وہاں بھیجا جائے۔ کنور شیر سنگھ نے حکم دیتے ہوئے کہا۔ پانچ مسلح افراد کا دستہ جب جنگل میں داخل ہوا تو سید احمد بریلوی کے ساتھیوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ تین افراد مارے گئے۔ باقی دو تیراک تھے۔ انھوں نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ اور کنارے پہنچ کر کنور سنگھ کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ اتنے میں جمعدار ٹیک سنگھ کشمیر سے ایک ہزار مسلح افراد کا دستہ لے کے گڑھی پہنچ گیا دوسری طرف ہزارہ کی جو فوج شنکیاری میں تھی اور جیسے پیش قدمی کا حکم پہلے ہی مل چکا تھا۔ شام ڈھلے مٹی کوٹ کے پہاڑ پر پہنچ گئی اور پھر رات کے اندھیرے میں موضع بالا کوٹ کی پہاڑی پر اُتر آئی۔[۴۴]

مہتاب سنگھ نے بھی اس واقع کو بھی لکھا ہے جو میں یہاں درج کر رہا ہوں۔

ایک دو دفعہ کنور شیر سنگھ افسران سمیت سوار ہو کر اپنے ڈیرہ سے بطرف بالاکوٹ گئے تا کہ موقع کا ملاحظہ کر سکیں۔ جب گھڑی تیار ہو گئی تو اپنے ڈیرہ سے روانہ ہو کر دریا کے کنارے کنارے آ کر کوٹ بیلہ جو بالا کوٹ سے تین کوس ہو گا پر مقام کیا۔ خلیفہ سید احمد شاہ اس وقت بالا کوٹ میں تھا۔ کنور شیر سنگھ ایک دو دفعہ بالاکوٹ، دریا کے کنارے کنارے دور بین سے ملاحظہ کیا اور کہا دریا کے اس

طرف سے خلیفہ کے ڈیرہ پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ اس امر پر ہر روز مشورے ہوتے رہے ایک دن خلیفہ نے پوشیدہ طور پر سروٹ کے جنگل میں چھپا دیا اور اپنے ڈیرہ میں چاول پکا کر چھوڑ دیئے اور خود وہاں سے ہٹ گئے تا کہ بہت سے پرندے ان کو کھانے کے لئے جمع ہو جائیں جب کنور شیر سنگھ نے دو تین گھڑی دن چڑھے دور بین لگا کر دیکھا تو کہا خلیفہ بالاکوٹ سے بھاگ گیا ہے۔ اس کا ڈیرہ خالی ہے اور پرندے اس کے ڈیرہ پر جمع ہو کر چگ چر رہے ہیں۔ کنور شیر سنگھ نے صورت حال معلوم کرنے کے لئے پانچ سوار اور پانچ پیادے فوری طور پر خبر لانے کے لئے روانہ کئے۔ جب یہ سوار اور پیادے سروٹ کے جنگل میں داخل ہوئے تو خلیفہ کے چھپے ہوئے لوگوں نے پانچ سواروں اور تین پیادوں کو قتل کر دیا۔ مگر دو پیادے جو تیراک تھے دریا میں کود پڑے اور تیر کر دریا پار کر کے اپنے ڈیرے میں پہنچ گئے اور اس واقعہ کی خبر پہنچائی کہ یہ سب لوگ خلیفہ کے فریب کا شکار ہو گئے اور قتل کر دیئے گئے۔[۴۵]

ج۔ سید احمد بریلوی اور سکھوں کے درمیان معرکہ بالاکوٹ

برصغیر کے مسلمان اس معرکے کو بہت اہم گردانتے ہیں اور ہندوستان و پاکستان کے مسلم علماء و مفکر اس جنگ کو مسلمانوں کے عروج کے لئے آخری کوشش گردانتے ہیں۔ اب ہم اختر رضا سلیمی کا ناول جاگے ہیں خواب میں اور مہتاب سنگھ کی تاریخ ہزارہ کی روشنی میں جائزہ لے گے۔ مہتاب سنگھ کی تاریخ کے علاوہ ہمارے پاس دوسرا مستند حوالہ نہیں ہے۔ کیونکہ مہتاب سنگھ خود ایک سکھ تھا اور تیس سال سے زیادہ عرصہ اس نے ہزارہ میں گزارا تھا۔ ایسے وقت میں جبکہ وہاں سکھوں کی حکومت تھی بلکہ عین ممکن ہے کہ وہ معرکہ بالاکوٹ میں شریک ہوا ہوں۔ کیونکہ اس نے جذبات کے ساتھ اس جنگ کے واقعات لکھے ہیں۔

اختر رضا سلیمی اس جنگ کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

ہوتروں (دھان کے کھیت) میں سید احمد بریلوی اور ان کے ساتھی پڑاؤ کئے ہوئے تھے۔ پو پھٹتے ہی کنور سنگھ اور مہاں سنگھ نے اپنی فوج کو حملے کا حکم دے دیا۔ سید احمد بریلوی اور اسماعیل دہلوی بھی اپنی مختصر سی فوج لے کر میدان میں

اُتر گئے اور نعرہ تکبیر اللہ اکبر کا آواز بلند کرتے ہوئے جوابی کاروائی میں مصروف ہو گئے۔ دن کے پہلے پہر سے دوپہر تک دونوں جانب سے گولہ باری ہوتی رہی۔ دونوں طرف سے کچھ لوگ مارے بھی گئے۔ مگر کوئی بھاری جانی نقصان نہیں ہوا۔ دونوں طرف کا پلڑا برابر رہا۔ دوپہر کے وقت نور خان اور عبداللہ خان نے اپنے ایک مختصر سے دستے کے ساتھ پہاڑی کی دوسری طرف سے جا کر سکھ فوج کے نشان برداروں کو نشانہ بنایا۔ جو وہیں ڈھیر ہو گئے اور ان کے ہاتھ سے جھنڈے گر گئے جس سے سکھ فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ اس دوران سکھ فوج کا خاصا جانی نقصان ہوا جس کے سبب سے وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئی۔ سید احمد بریلوی نے میدانی علاقوں سے ساتھ آئے ہوئے چارسو کے قریب اپنے فدائیوں کو وہیں ہوتروں میں پوزیشنیں سنبھالنے رکھنے کا حکم دیا۔ جب کہ خود دوسوستر کے قریب مقامی جانثاروں، جن میں عبداللہ خان اور نور خان بھی شامل تھے کو لیکر پہاڑ کے دامن کی طرف جدھر سکھ فوج نے پسپائی اختیار کی تھی۔ نکل کھڑے ہوئے ۔ وہ پہاڑ کے دامن میں پہنچے ہی تھے کہ ایک طرف سے شام سنگھ اور پرتاب سنگھ اٹاری جب کہ دوسری طرف سے سردار عطر سنگھ کالیاں والا اور گورمکھ سنگھ بھلہ کے زیرکمان بھاری دستوں نے انھیں گھیر کر ایسا بھرپور حملہ کیا کہ سید صاحب کی فوج کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ پرتاب سنگھ کی زیر کمان فوج کے ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر سید احمد بریلوی کو نشانہ بنایا۔ ایک گولی ان کے دائیں ہاتھ جب کہ دوسری ان کے سینے کے بائیں حصے میں عین دل پر لگی۔ سید احمد بریلوی کے گرتے ہی جنگ کا پانسا پلٹ گیا۔ سہ پہر کے وقت سید صاحب کے جان نثاروں کی ایک سو ستاسی لاشیں پہاڑی کے دامن میں جب کہ چارسو کے قریب پیچھے ہوتروں میں پڑی تھیں۔[۴۶]

مہتاب سنگھ نے لکھا ہے کہ سکھ فوج کو پانی کی سخت قلت کا سامنا تھا۔ یہ جنگ سید احمد بریلوی اور ان کے مجاہدین آسانی سے جیت جاتے اگر قدرت نے بارش نہیں کئے ہوتی۔ مہتاب سنگھ لکھتے ہیں۔

> جب سکھوں کی فوج مع کنور شیر سنگھ اور افسران پہاڑ کے ڈنہ پر پہنچ گئے۔ تو وہاں پانی کا ایک قطرہ بھی نہ تھا۔ حیران ہوئے کہ ایک دو دن کھانے نہ ملنے سے وقت گذارا جا سکتا ہے لیکن پانی کے بغیر کس طرح گزارہ ہوگا۔ سب اس فکر میں پریشان تھے۔ قدرت الٰہی نے بادل کا ایک ٹکڑا شمال کی جانب سے اُٹھا اور اس نے ڈنہ پر آکر ژالہ باری شروع کر دی۔ مگر کسی آدمی یا جانور کو کوئی نقصان نہ پہنچا اور پینے اور روٹی پکانے کے استعمال کے لئے اتنا وافر پانی ہوگیا کہ لوگوں نے تمام برتن، جو ان کے پاس تھے اولوں سے بھر لیے۔ ایک ساعت میں وافر میٹھا، خوشگوار اور ستھرا پانی مہیا ہوگیا۔ اس آسمانی امداد سے سکھوں کی فوج، پانی اور سے آسودہ ہوگئی۔[۴۷]

اس جنگ نے سکھوں کو کافی پریشان کر دیا تھا اس وجہ سے وہ سوچ سمجھ کر منصوبے بنا رہے تھے کیونکہ اگر اس جنگ میں سکھوں کو شکست ہو جاتی، تو پورا ہزارہ ان کے ہاتھ سے نکل جاتا۔ پہلے تو سکھوں نے فیصلہ کیا کہ قریب ہی پہاڑی چوٹی کو دو گروپ سنبھالے گے اور دو گروپ بالاکوٹ میں سید احمد بریلوی سے جنگ کریں لیکن جلد انہوں نے یہ فیصلہ تبدیل کیا اور سوچا کہ اگر ان کو شکست ہو جاتی ہے تو پھر ہمارا بھی خیر نہیں کیونکہ یہ مسلمانوں کا ملک ہے اور وہ ہمیں لاہور بھاگنے نہیں دیں گے۔ اس وجہ سے سب نے مل کر سید احمد شہید کے ساتھ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ سکھوں نے اگر یہ فیصلہ نہ کیا ہوتا تو عین ممکن ہے کہ ان کو شکست ہو جاتی اور سب مارے جا چکے ہوتے۔ سکھوں نے جب یہ فیصلہ کیا تو مقام جنگ کی طرف روانہ وہ گئے۔ بالاکوٹ کے پہاڑوں میں سید احمد بریلوی کے مجاہدین تیر، تفنگ اور چھوٹی توپوں کے ساتھ گھات میں بیٹھے تھے۔ جب سکھوں کی فوج نیچے اُتری تو دونوں جانب سے توپ اور بندوق کے فائر شروع ہو گئے۔ دن کے ایک پہر گزرنے سے کوئی نقصان نہیں ہوا لیکن سکھوں پر مصیبت اس وقت ٹوٹ پڑی جب ان کے دو نشان بردار مارے گئے اور جھنڈے ان کے ہاتھ سے گر گئے۔

مہتاب سنگھ لکھتے ہیں۔

> جھنڈوں کے گرتے ہی خلیفہ کے جتنے آدمی بالاکوٹ میں تھے سب نے دفعتاً حملہ کر دیا۔ بلکہ خلیفہ سید احمد شاہ اور مولوی اسماعیل ، جو فوج کے سب سے

بڑے افسر تھے نے حملہ شروع کر دیا اور اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے ہوئے اور جوش و غضب میں داڑھیاں، دانتوں کے نیچے دب کر ہوتروں (دھان کے کھیتوں) میں آگئے اور اونچی آواز سے حکم دیا کہ کافروں پر حملے کرو۔ وہ بھاگ رہے ہیں، جانے نہ پائیں۔ چونکہ قضا و قدر میں ان دونوں کی اور ان کے ساتھیوں کی موت کا وقت قریب آ چکا تھا یہ سب حملہ کر کے ہوتر کی زمینوں سے گزر کر پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے۔ جہاں ایک طرف سردار شام سنگھ، سردار پرتاب سنگھ اٹاری والوں کی فوج تھی۔ اور دوسری طرف سردار عطر سنگھ کالیانوالہ۔ گورمکھ سنگھ بھلہ وغیرہ کی فوج تھی اور ہزارہ کی فوج زیر کمان جہاں سنگھ اور کنور شیر سنگھ کی فوج بالمقابل تھی جس سے جنگ ہوئی۔ پہلے ہلے میں سکھوں کی فوج میدان سے پیچھے ہٹ گئی۔ آخر کار کنور شیر سنگھ میاں سے تلوار نکال کر سب سے آگے ہو گیا۔ مگر سردار مہاں سنگھ اور اس کے ہمراہوں نے منع کیا۔ کہ آپ کا اکیلے آگے جانا مناسب نہیں لیکن کنور شیر سنگھ نے اس کسی کی بات نہ سنی اور شمشیر بدست دس بارہ قدم آگے نکل کر ان لوگوں پر تھپر مارے جو مقابلے سے ہٹ کر باہر آ رہے تھے اور اسی جگہ کھڑا رہ کر اپنا ایک اردلی سردار شام سنگھ، پرتاب سنگھ اٹاری والوں کی طرف خبردار کرنے کے لئے بھیجا جو پہلے ہی سے ہوشیار تھے اور بندوقیں چلا رہے تھے۔ اور ایک آدمی عطر سنگھ کالیانوالہ کی طرف اور آفریں دی کو خوب فائر کر رہے ہو۔ چنانچہ دونوں جانب سے بندوقیں چلنی شروع ہو گئیں۔ خلیفہ کے ساتھ کے لوگوں سے ایک سو ستاسی آدمی (ملکی مترجم) انہی ہوتروں میں، جو خلیفہ پر فدا تھے، ایک دوسرے کے اوپر مر کر ڈھیر ہو گئے۔

۴۸

ان اقتباسات کو پڑھ کر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ سید احمد شہید کے مجاہدین نے غیر معمولی جذبات سے کام لیا۔ اور اسی جذبات میں لڑتے ہوئے وہ نیچے دامن میں آ گئے جس کی وجہ سے یہ گولیوں کے زد میں آ گئے۔ دوسری بات جنگی حکمت عملی بھی ہوتی ہے۔ سید احمد بریلوی کے پیروکار مسلمانوں کے قرون وسطی

کے دور سے چونکہ جذباتی طور پر متاثر تھے اس وجہ سے اون کے طرز پر جنگ لڑنا چاہتے تھے یعنی دشمن کے لشکر پر ہلہ بولنا حالانکہ یہ طریقے اس زمانے میں کارگر نہیں تھا۔ جب ہر طرف سے بندوقیں چل رہے تھے اور بھاری توپ خانیں بھی مسلسل گولیاں برساں رہی تھیں۔ تیسری بات یہ کہ سید احمد شہید کے ساتھ فوج کم تھی جبکہ اس کے مقابلے میں سکھ فوج کئی گنا زیادہ تھی اور توپ خانوں سمیت ہر قسم کے ہتھیار سے لیس تھی۔ بالاکوٹ کے مقام پر سید احمد بریلوی نے ہندوستان میں مسلمانوں کو دوبارہ عروج اور اسلام کے احیاء کے لئے 1831ء میں آخری معرکہ لڑا۔ جس میں مسلمانوں کو شکست ہوئی اور اکثر مجاہدین شہید ہو گئے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اس تحریک کا مقصد ایک اسلام ریاست کا خواب تھا۔ جس کے لئے انھوں نے شمالی مغربی ہندوستان کا رخ کیا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ افغانوں میں مذہبی غیرت وحمیت زیادہ ہیں۔

سید احمد شہید کی لاش کے حوالے سے کئی باتیں زبان زد عام ہیں۔ یہ کہ آپ کی لاش کہاں گئی۔ اس حوالے سے کئی باتیں مشہور ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ شہادت کے بعد ان کی لاش غائب ہو گئی۔ سید صاحب کے بعض معتقدین جو انہیں مہدی موعود سمجھتے تھے یہ خیال کرتے رہے کہ سید صاحب غائب ہو گئے ہیں لیکن زیادہ صحیح روایت یہی ہے کہ وہ اس جنگ میں 24 ذیعقد 1246 یعنی 1831 کو بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔ ۴۹؎

جنگ کے بعد مجاہدین نے کوشش کی کہ لاش اٹھا کر لے جائیں۔ لیکن سکھوں کے دستے پیچھے جا رہے تھے اس وجہ سے اس میں وہ ناکام ہو گئے۔ اختر رضا سلیمی لکھتے ہیں۔

> باقی ماندہ جان نثاروں کو جن کی تعداد اسی کے قریب تھی پسپائی اختیار کرتے ہی بنی جاتے ہوئے انھوں نے سید احمد بریلوی کی لاش کو بھی اُٹھا کر ساتھ لے جانے کی کوشش کی۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ سکھ فوج کا ایک دستہ ان کے بہت قریب پہنچ چکا تو انھوں نے بہت احترام کے ساتھ زمین پر رکھا اور آگے بڑھے۔ یک دم نور خان کی ذہن میں کوئی خیال ابھرا اس نے عبداللہ خان اور اپنے دوچار دیگر ساتھیوں کے کان میں کچھ کہا؟ انھوں نے اپنی بندوقیں پرے پھینکیں اور نیام سے تلوار نکال کر واپس میدان جنگ کی طرف دوڑ لگا دی، اور وہاں پہنچ کر اپنے ہی ساتھیوں کے مردہ جسموں پر چل پڑے۔ انھوں نے دو

> درجن کے قریب لاشوں کے سر تن سے جدا کئے اور پھر نور خان نے سید احمد بریلوی کا سر تن سے جدا کر کے اور اپنے دوسرے ساتھیوں سمیت میدان جنگ سے فرار گیا۔ سکھوں نے بالاکوٹ تک ان کا پیچھا کیا لیکن وہ ہاتھ نہ آئے۔ ۵۰

یہاں اختر رضا سلیمی نے ناول کی ایک فرضی کردار کے ذریعے یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ سید احمد شہید کا سر لے کر فرار ہو گیا۔ لیکن مہتاب سنگھ نے یہاں ایک مختلف بات کی ہے کہ سید احمد شہید کا ایک ساتھی سر لے کر جا رہا تھا کہ وہ سکھوں کے فائرنگ کے زد میں آ گیا اور جب زخمی ہوا تو اسی دوران سید صاحب کا سر سرسوں کے خرمن میں جہاں وہ گرا تھا چھپا دیا۔

مہتاب سنگھ لکھتے ہیں۔

> اس کے باقی ماندہ ہمراہیوں نے جو کم و بیش اسی کے قریب تھے تین چار مرتبہ حملہ کیا کہ خلیفہ کی لاش کو اٹھا کر لے جائیں۔ لیکن سکھوں کی جانب سے گولیوں کی بوچھاڑ مثل بارش کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے۔ لاچار خلیفہ کا سر کاٹ کر ساتھ لے گئے لیکن جب تھوڑی دور گئے تھے تو جس شخص نے خلیفہ کا سر اٹھایا ہوا تھا۔ اس کو گولی لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ لیکن مرتے مرتے اس نے خلیفہ کا سر سرسوں کے خرمن میں چھپا دیا۔ اس کے ساتھی فرار ہو گئے۔ سکھوں نے ان کا تعاقب کیا اور بالاکوٹ میں پہنچ گئے اور جا کر خلیفہ اور دوسرے لوگوں کے گھروں کو لوٹ لیا۔ اور آگ لگا دی۔ خلیفہ کے سامان لشکر سے آٹھ چھوٹی توپیں، ایک ہاتھی بارہ گھوڑے اور کچھ خچریں سکھوں کے ہاتھ لگے۔ ۵۱

سید احمد بریلوی کی لاش کی شناخت کے حوالے اختر رضا سلیمی اور مہتاب سنگھ کے موقف میں تھوڑا فرق پایا جاتا ہے۔ مہتاب سنگھ کے بقول کہ سید احمد بریلوی کا سر سکھوں کے ہاتھ لگا تھا۔ جبکہ اختر رضا سلیمی نے لکھا ہے سید احمد بریلوی کے معتقدین نے اس کے سر کو دفن کیا تھا ہمیں مہتاب سنگھ کی رائے زیادہ صحیح لگتی ہے کیونکہ وہ خود سکھ ریاست کا ملازم تھا اور سب کچھ اپنے چشم سے دیکھا تھا۔ اب میں دونوں کے اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

اختر رضا سلیمی لکھتے ہیں۔

فتح کے بعد شام ڈھلے کنور شیر سنگھ میدان جنگ میں گیا اور حکم دیا کہ بالاکوٹ سے کسی ایسے شخص کو بلا کر لایا جائے جو خلیفہ کی لاش کی شناخت کر سکتا ہو۔ جتنے لوگ بھی لائے گئے وہ سید احمد بریلوی کی لاش کی شناخت میں ناکام رہے پھر انہوں نے تمام سر بریدہ لاشوں کو اکٹھا کیا تو سر بریدہ تن بائیس جب کہ کٹے ہوئے سر اکیس تھے۔ کنور سنگھ معاملے کی تہہ تک نہ پہنچ گیا۔ اس نے نواب خان کو بلایا جو آڑھائی تین سال سید احمد بریلوی کے ساتھ رہا تھا اور بعد میں اس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ نواب خان نے سر بریدہ تنوں کا معائنہ کرنے کے بعد کہا: باری باری ہر سر بریدہ تن کے پاؤں کی انگلیاں دیکھی جائیں۔ جس تن کے پاؤں کی انگلیوں کے تمام ٹیڑھے ہوں وہ سید احمد بریلوی کی لاش ہو گی۔ کنور شیر سنگھ نے خود تمام سر بریدہ لاشوں کی انگلیوں کا معائنہ کیا۔ ایک لاش کے پاؤں کی انگلیوں کے ناخن واقع ٹیڑھے تھے۔ خلیفہ کی لاش سکھ فوج کے مسلمان ملازموں کے حوالے کر دو تا کہ وہ اسے کہیں دفن کر دیں۔ کنور شیر سنگھ نے مہاں سنگھ کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ مہاراج کا حکم سر آنکھوں پر لیکن اس طرح مسلمانوں میں خلیفہ سے عقیدت بڑھے گی۔ وہ اس کی قبر کو پوجیں گے اور اس کی کرامات کا چرچا کریں۔ اس سے مسلمانوں میں ہمارے خلاف بغاوت کا جذبہ اور بڑھے گا۔ مہاں سنگھ نے عاجزی سے کہا۔ ہاں تم نے بڑے پتے کی بات کی ہے۔ ٹھیک ہے اس کو جلا دو، کنور سنگھ نے کہا کہیں مہاراج اس مُسلے کی لاش کو جلانا مناسب نہیں ہو گا۔ مہاں سنگھ نے اختلاف کیا تو ۔پھر، کنور سنگھ نے پوچھا۔ اس کے ٹکڑے کر کے دریا میں بہا دیتے ہیں۔ مہاں سنگھ نے کہا۔ ٹھیک ہے۔ اسے اٹھا کر لے جاؤ۔ کنور شیر سنگھ نے مہاں سنگھ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ رات کے پچھلے پہر آٹھ سکھوں نے مہاں سنگھ کی نگرانی میں لاش کا انگ انگ جدا کیا اور اسے دریا میں بہا دیا۔ جنھیں بعد میں پچیس پچیس روپے انعام

سے نوازا گیا۔۵۲

مہتاب سنگھ نے اس واقع کو ذرا تفصیل سے لکھا ہے اور لکھا ہے کہ سید احمد شہید کے لاش کو تو نواب خان تنولی نے نہ پہنچانا لیکن یہ کہا اگر اس کے ساتھ سر ہوتا تو شناخت میں آسانی ہوتی۔ مہتاب سنگھ لکھتے ہیں۔

> اس فکر میں تھے کہ بوقت عصر ایک سپاہی ملازم کالا خان تنولی والد فیروز خان تنولی آیا اور بیان کیا کہ اگر اس کو کچھ انعام دیا جائے تو وہ خلیفہ کے سر کا بتا دے گا۔ کنور شیر سنگھ نے اس کو پچیس روپے انعام دیا اور ۲۵ سوار اور ۵۰ پیادے اس کے ساتھ بھیج کر کہا کہ جہاں خلیفہ کا سر ہے وہاں جائیں اور سر کو لے آئیں۔ چنانچہ وہ سپاہی ان کے ساتھ میدان جنگ میں گیا اور سروں کے اس خرمن سے جہاں خلیفہ کے مرنے والے سپاہی نے اس کو چھپا دیا تھا نکال کر ان کے حوالے کر دیا۔ سر کو لاش کے ساتھ جوڑ کر سیدھا کر دیا۔ اس کے بعد کنور شیر سنگھ نے نواب خان تنولی کو پھر بلایا کہ وہ دیکھ کر بخوبی شناخت کرے کہ کیا یہ خلیفہ کا ہی سر ہے۔ یا کسی دوسرے کا؟ چنانچہ نواب خان تنولی نے سر دیکھنے کے بعد یقین سے کہا کہ یہ سر واقعی خلیفہ سید احمد شاہ کا ہی ہے۔۵۳

اختر رضا سلیمی نے اس سے تھوڑا مختلف لکھا ہے اس نے لکھا ہے کہ سید احمد بریلوی کا سر سکھوں کے ہاتھ نہیں لگا تھا بلکہ وہ سید احمد بریلوی کے معتقدین ساتھ لے کر گئے۔ اور ان کا جنازہ بھی پڑھایا گیا۔ مہتاب سنگھ نے لکھا ہے کہ سر ملنے کے بعد سید احمد بریلوی کی لاش کو سکھوں کی فوج میں مسلمان سپاہیوں کے حوالے کیا گیا۔ اس کے بعد سکھوں کے مسلمان ملازموں نے ساری رات بیداری کی اور لاش کے پاس مرثیہ خوانی کرتے رہے۔تاریخ ہزارہ149۔سکھوں نے کنور شیر سنگھ کے حکم سے لاش دریا کے کنہار کے کنارے دفن کر دیا۔لیکن بعد میں ان کو تشویش ہوا کہ اگر خلیفہ کی قبر اس علاقے میں رہ گیا تو لوگ اس کے پوجا کریں گے اور لوگوں میں سکھوں کے خلاف نفرت بڑھے گی۔ اس وجہ سے لاش کو دوبارہ نکال کر دریا کنہار میں دریا برد کیا گیا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ تاہم اب میں اختر رضا سلیمی کا وہ اقتباس نقل کر رہا ہوں جس میں سید احمد بریلوی کے مقامی مجاہدین سید احمد بریلوی کے سر کو سامنے رکھ کر ان کا جنازہ پڑھا رہا

ہوتا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سید احمد بریلوی کا سر سکھوں کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اختر رضا سلیمی نے فکشنائز کرنے کے لئے یہ واقعہ اسی طرح لکھے ہوں ۔ وہ لکھتے ہیں۔

> انھوں نے دریا کے کنارے ایک اونچی جگہ کو نشان زد کیا اور زمین کھودنے لگے۔ جب قبر تیار ہوگئی تو انھوں نے مرشد کے سر کو ایک کپڑے سے نکال کر غسل دیا اور اسے میدان کے مغربی کنارے پر واقع ایک اونچے پتھر پر رکھ کر صفیں ترتیب دینے لگے۔ فیصلہ کیا گیا کہ نماز چوں کہ فرض کفایہ ہے اس لیے سب کا جماعت میں شامل ہونا ضروری نہیں۔ لہذا کچھ لوگ چاروں طرف پہرہ دیں۔ نماز جنازہ کے بعد مرشد کے سر کو اس نے اپنے ہاتھوں سے انتہائی عقیدت و احترام کے ساتھ قبر میں اتارا اور قبر پر تختے رکھنے کا عمل شروع کیا گیا۔ جس میں وہ خود بھی پیش پیش تھا۔۵۴

د۔ 1841ء کی طوفانی بارشیں

1841ء میں ہزارہ میں نوروز مسلسل بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے کیکوٹ (نور آباد) میں کئی مکانوں کے چھت گر گئے تھے اور کئی لوگ مرے تھے۔ ناول سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نو روز اہل ہزارہ پر قیامت بن کر گزری۔ جو لوگ چھت گرنے یا دوسری حادثات کی وجہ سے مرے تھے بارشوں کی وجہ سے لوگ اپنے میتوں کو بھی نہیں دفنا سکتے تھے۔ اختر رضا سلیمی بارش اور گرے ہوئے مکانوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> بارش بستی والوں پر عذاب بن کر نازل ہوئی تھی ابھی تک وہ لمحہ بھر کے لئے بھی نہیں رکی تھی جس کی وجہ سے گرے ہوئے اس مکان کی مٹی اور ملبا ہٹانے میں انھیں بہت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ مگر وہ گزشتہ تین چار گھنٹوں سے مسلسل اپنے کام میں جتے ہوئے تھے۔ ابھی وہ گرے ہوئے مکان کی چھت کے ایک سرے سے بھی پوری طرح مٹی نہیں ہٹا پائے تھے کہ صبح کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے۔ اور لالٹینوں کی روشنیاں مدھم ہوتی چلی گئیں۔۵۵

بستی کے لوگ ڈر کی وجہ وے سے سہمے ہوئے تھے کہ اسی طرح اگر بارش جاری رہی تو ہوسکتا ہے کہ ساری بستی کے مکانات زمین بوس ہو جائیں۔ ابھی تک علی احمد کی لاش نہیں دفنائی جا چکی تھی۔ وہ بارش سے پہلے طبعی موت مرا تھا لیکن تیز بارش کی وجہ سے اس کے لئے قبر تیار کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ سلیمی لکھتے ہیں۔

> اتنی تیز بارش میں قبریں کیسے تیار ہو گی۔ مائی زمین کے اندر اب ایک قطرے کی بھی گنجائش نہیں۔ جو قطرہ گرتا ہے تیر جاتا ہے۔ گینتی کا پھل زمین میں گھونپو تو واپس نکالنے سے پہلے سوراخ پانی سے بھر جاتا ہے۔ بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی اور ادھر بستی والوں کے سر پر تین مزید قبروں کا ملبا آن گرا۔ دوپہر تک وہ بارش رکنے کا انتظار کرتے رہے۔ لاش پھول گئی ہے۔اور اس کے منہ اور ناک سے خون آ رہا ہے۔۵۶

آخر کار بستی والوں نے فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو ہمیں میتوں کو دفنانا چاہیے۔ بالآخر انھوں نے مرلہ بھر زمین منتخب کر کے سب سے پہلے نکاسی پانی کا بندوبست کیا اور پھر اس کے چاروں طرف نالیاں کھودی گئی تاکہ اس میں پانی داخل نہ ہو سکے۔ گرے ہوئے مکان کے شہتیر لائے گئے اور انھیں منتخب جگہ کے چاروں کونوں میں عمودی نصب کیا گیا اور ان کے اوپر موٹے ترپال ڈال کر تین قبروں کی کھودائی شروع کر دی گئی۔

اختر رضا سلیمی لکھتے ہیں۔

> شام کے وقت علی احمد وہاں اکیلا نہیں تھا نور خان کی بیوی، بیٹی اور بہو بھی ان کے پہلو میں سو رہی تھیں۔ اور بستی کے مکینوں کو یوں لگا جیسے ایک بہت بڑا بوجھ ان کے سر سے اتر گیا۔ اگلے پانچ چھ دنوں میں بہت سی بھیڑ بکریوں اور مال مویشوں کے علاوہ بہت سارا حساب بھی بارش کی نذر ہو گیا۔ مگر بستی والوں کو جنازے دفنانے ہی سے فرصر نہیں تھی۔ بارش کے اختتام تک مکانوں کے پیچھے بڑی کھیت میں تیرہ قبروں کا مزید اضافہ ہو چکا تھا اور نور خان کے گرے ہوئے مکان کے شہتیر بھی ختم ہو چکے تھے۔۵۷

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب

دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

(غالب)

بالآخر بارش کا یہ عذاب ٹل گیا نوویں روز عصر کے وقت بادلوں میں شگاف پڑنے شروع ہوئے۔ بستی والوں کے چہرے کھل گئے اور موت کے خوفناک سائے جو ان کے سروں پر گردش کر رہے تھے دور ہو گئے۔

بارش ٹلنے کے چوتھے روز ناڑہ نیلاں سے ایک آدمی یہاں کے سوگوار کے لئے ایک خوش خبری لایا اس نے بستی والوں کو بتایا: پہاڑوں کے اس پار ہزارہ کے میدان میں زبردست سیلاب آیا۔ جس سے سکھ افواج کا بھاری جانی و مالی نقصان ہوا سکھ افواج جو مسلمانوں کا قتل عام کر رہی تھیں۔ اس کے بندوقیں، نیزے، بھالے، تلواریں، گھوڑے، اونٹ حتیٰ کہ ہاتھی اور توپیں بھی بارش بہا کر لے گئے۔ بیسوں فوجی بھی ڈوب مرے۔ جو بچ گئے انھیں طرح طرح کی بیماریوں نے آ لیا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی بستی والوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ میں نہیں کہتا تھا۔ خدا کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ نور خان نے دور آسمان کی نیلاہٹوں میں گھورتے ہوئے کہا۔ اور بستی والوں کو یقین ہو گیا کہ گزشتہ نو روز بارش نہیں رحمت برستی رہی تھی۔ ۵۸

ح۔ ہزارہ پر انگریزوں کا قبضہ اور میجر ایبٹ

پنجاب میں انگریزوں کے ہاتھوں سکھوں کو شکست ہوئی تھی اور لاہور ان کے ہاتھوں سے چلا گیا تھا جو ان کی دارالحکومت تھی۔ ملتان میں بھی انگریز قابض تھے۔ اب ایک ہزارہ اور جموں و کشمیر رہتے تھے۔ اس وجہ سے انگریز اس خطے پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے۔ ملتان میں جب سکھوں نے بغاوت کیا تو ہزارہ میں بھی سردار چتر سنگھ کی ایماء پر سکھوں نے بغاوت کیا۔ درانی اور سکھ دونوں نے بہت کوشش کی کہا انگریزوں کو شکست ہوں لیکن ناکام ہو گئے۔ اور میجر ایبٹ جو پہلے حاکم ہزارہ سردار چتر سنگھ کا مشیر تھا بعد میں عملاً حکمران بن گیا۔ اختر رضا سلیمی میجر ایبٹ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

ہزارہ میں وہ پہلی بار آج سے تین سال پہلے سرحد کھٹڑ، گندگر، خان پور اور جموں

> کی سرحدات کی حد بندی کے سلسلے میں آیا تھا۔ دوسری بار وہ دو سال پہلے ریاست جموں اور ملک لاہور کے درمیان حد بندی کے سلسلے میں آیا تھا۔ یہ کام اس نے چند مہینوں میں مکمل کر لیا جس کے فوراً بعد اسے حاکم ہزارہ سردار چتر سنگھ کا مشیر مقرر کر دیا گیا۔ بظاہر وہ اس کا مشیر تھا لیکن عملاً وہی حکمران تھا، ہزارہ میں فوج کا نقل وحرکت ان کی تنخواہ کی ادائیگی ، مالیہ اور دیگر واجبات کی وصولی اور خزانے کا انتظام اسی کے حکم سے چلتا تھا۔ عدالت کا نظام بھی براہ راست اسی کے ماتحت تھا۔ یہاں تک کہ پشاور میں متعین انگیز افسروں کا بھی وہی مشیر تھا۔ اس دوران میں اس نے ہزارہ کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ قلعے مرمت کروائے۔ اور ملک کے کتب ہائے مالیہ مقرر کیں۔ انہی دنوں میں مولراج حاکم ملتان نے بغاوت کر دی جیسے ہی اس کی خبر ہزارہ میں پہنچی یہاں کے فوج نے بھی سردار چتر سنگھ کے ایما پر بغاوت کر دی جس کے نتیجے میں ان دونوں میں آویزش ہو گئی۔ ۵۹

بالآخر گجرات اور جہلم کے مقامات پر سردار چتر سنگھ اور درانیوں کے فوج کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اور دوسری طرف ملتان کے بغاوت پر بھی انگریزوں نے قابو پایا اور ملتان کو فتح کیا۔ درانی فوج ہزارہ سے ہو کر کابل چلی گئی اور سکھوں نے روپ بدل کر پنڈی سے فرار ہو گئے۔ ان جنگو ں کے بعد 16 اپریل 1849ء کو میجر ایبٹ ہزارہ میں آیا۔ یہاں تمام قلعے اپنے قبضے میں لے لیے۔ اور عملاً تمام ہزارہ کا حکمران بن گیا۔ سکھوں کی مزاحمت دم توڑ گئی۔ اور درانی افواج بھی شکست کھا کر کابل فرار ہو گئیں تھیں۔ اس وجہ سے اب میجر ایبٹ ہزارہ کے قبائلی مزاحمت سے نمٹ رہا تھا اور بالآخر ان بغاوتوں پر بھی قابو پایا۔ مقاموں لوگوں کے ساتھ میجر ایبٹ کے تعلقات دوستانے تھے۔ سلیمی صاحب لکھتے تھے۔

> ایبٹ عام لوگوں میں بہت جلد گھل مل جاتا تھا وہ ہر آدمی کی شکایات پوری توجہ سے سنتا۔ اور اس کے ازالے کے پوری کوشش کرتا تھا اس لئے دو سالوں کے انتہائی مختصر عرصے میں اس نے سکھوں کے مظالم سے تنگ آتے ہوئے لوگوں کے دل جیت لیئے۔ مختلف قبیلوں کے سرداروں سے لیکر عام آدمی تک، لوگوں کی

> اکثریت اس پر اور لوگوں پر اعتبار کرنے لگا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ آویزش شروع ہوتی اور ریذیڈنٹ نے اسے محتاط رہنے کا حکم دیا تو اس نے لکھا: اس ملک میں میری طاقت کا اندازہ فوج کی تعداد سے نہیں۔ بلکہ لوگوں کے اس اعتماد سے لگایا جائے۔ جو وہ مجھ پر بطور اپنے ایک خیر خواہ دوست کے رکھتے ہیں۔٦٠

میجر ایبٹ نے اہل ہزارہ کو بزور شمشیر نہیں بلکہ اپنے مخلص طبیعت، سخاوت اور اخلاق کے ذریعہ رام کیا تھا۔ لوگ اس سے محبت کرتے تھے۔ ڈاکٹر خان، بہادر بنی لکھتے ہیں۔

> لوگ اس پر فدا تھے اور وہ ان پر مہربان تھا بچے تو اس کے اردگرد پروانوں کی طرح جمع ہو جاتے تھے اور شور مچاتے کہ چچا ایبٹ آ گیا۔ وہ بھی ان کی خوشنودی کے لئے اپنی جیبوں میں مٹھائی جمع رکھتا اور بچے دوڑ دوڑ کر اس کی جیب سے مٹھائی نکالتے اور کھاتے تھے۔٦١

سکھوں سے لڑائی کے دوان بہت سارے مقامی لوگ سردار سکھوں سے مل گئے تھے۔ گورنر جنرل چاہتے تھے کہ یہ ان لوگوں کی لسٹ دی جائے۔ لیکن میجر ایبٹ نے اس معاملے کو دبا دیا اور گورنر جنرل کو جواب دیا کہ محض شک کی بناء پر ہم ان کو گرفتار نہیں کر سکتے۔ اگر ہم یہ کام کریں گے تو لوگ بغاوت پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اسی مرکزی حکومت نے مطالبہ کیا تھا کہ پہاڑوں پر ایک چھاؤنی بنائی جائے۔ جس کی مخالفت میجر ایبٹ نے کی۔ ڈاکٹر خان بہادر لکھتے ہیں۔

> مرکزی حکومت کی تجویز تھی کہ میدان ہزارہ یا ڈھونڈو کرڈال کے پہاڑوں پر انگریزی فوجوں کے لئے چھاؤنی بنائی جائے۔ اس نے اس تجویز کی مخالفت کی اور اپنے دلائل تفصیل سے دیئے۔ جن کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ ہزارہ کے لوگ بہت غیرت والے ہیں۔ وہ کسی غیر قوم کے فرد کو خواہ وہ انگریز حاکم ہی کیوں نہ ہو۔ اپنے گھروں کے سامنے جہاں ان کی مستورات پر نظر پڑ سکتے۔ برداشت نہیں کر سکتے اور وہ گورہ سپاہیوں کے بے باکانہ حرکات سے یہ لوگ مشتعل ہو جائیں گے اور حکومت کو مشکلات پیش آ جائیں گے۔ لہذا ہزارہ کے پہاڑوں پر

انگریز فوج اور انگریز افسران کا مقیم کر دینا ایک خطرناک تجربہ ہوگا۔۶۲

اس طرح کے اقدامات سے اس نے بغاوتوں پر قابو پا لیا اکثر و بیشتر وہ مقامی بغاوتوں کے خلاف طاقت کے استعمال سے گریز کرتا رہا اور کوشش کرتے کہ گفت وشنید سے مسئلے کوحل کریں۔سلیمی لکھتے ہیں۔

اس کے ان فیصلوں کی وجہ سے ضلع بھر سے شورشوں کا خاتمہ ہو گیا تھا۔مگر ضلع کے جنوب مشرقی حصے میں ابھی شورشیں جاری تھیں۔ان تمام شورشوں کے پیچھے ایک ہی قبیلہ تھا۔اس شورش زدہ علاقے میں اس کے کئی ایک خیر خواہ بھی تھے۔ جو اسے وقتاً فوقتاً آ کر ملتے رہتے تھے اور اسے یہاں کے حالات سے بھی آگاہ کرتے رہتے تھے۔۶۳

پاکستان میں ۲۰۰۵ء کا ہولناک زلزلہ

۲۰۰۵ء میں جب پاکستان میں ایک فوجی آمر جنرل پرویز مشرف کی حکومت تھی تو پاکستان میں شدید زلزلہ آیا جس سے ملک بھر میں لاکھوں لوگ مرے اور زخمی بھی ہوئے۔۱۹۷۱ء کے سانحہ بنگال سقوط ڈھاکہ کے بعد یہ پاکستان کا بڑا حادثہ تھا۔اس زلزلے نے زیادہ نقصان مانسہرہ میں بھی کیا اور مانسہرو و بالاکوٹ کے تقریباً تمام گھر زمیں بوس ہوئے، ہزارہ کے معلوم تاریخ میں یہ پہلا حادثہ تھا جس مین لاکھوں لوگ اس حادثے کا شکار ہوئے ۔ اختر رضا سلیمی کا ناول بھی اسی زلزلے سے شروع ہووتا ہے۔ جب زلزلے کی وجہ سے مرکزی کردار زمان کو چوٹ لگ جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ کوما میں چلا جاتا ہے۔اسی کومے کی حالت میں وہ حال سے ماضی کا سفر کرتا ہے اور ڈھائی ہزار سال پیچھے چلا جاتا ہے۔اختر رضا سلیمی لکھتے ہیں:

عین اسی لمحے اسے ایک زور دار جھٹک محسوس ہوا۔ اس نے اپنے پاؤں کو گرنے سے بمشکل بچایا۔لڑکھڑاتے ہوئے اسے اپنے پاؤں کے نیچے کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی اور اس نے دیکھا کہ چٹان میں اس جگہ پر، جہاں اس کے دماغ کی لکیر سے ملتی جلتی لکیر تھی، دراڑ پڑ چکی ہے۔ اسے زمین ڈولتے ہوئے محسوس ہوئی ۔ اس کا رخ ' اس وقت پہاڑ کی طرف تھا، جہاں چیڑ کے

درخت زور زور سے ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔۶۴

زلزلے کے نتیجے میں سب سے زیادہ ہلاکتیں آزاد کشمیر اور پاکستان کے صوبے خیبر پختونخوا میں ہوئیں، جہاں سرکاری اعداد کے مطابق کل ۷۴،۶۹۸ تھیں۔ یہ ہلاکتیں ۱۹۳۵ء میں ہونے والے کوئٹہ زلزلے سے کہیں زیادہ تھیں۔ بھارتی مقبوضہ جموں کشمیر میں کل ۱۴۰۰ لوگ جان سے گئے جس کی تصدیق بھارتی حکومت نے کی۔ جبکہ عالمی امدادی اداروں کے مطابق اس زلزلے میں کل ۸۶،۰۰۰ لوگ جان سے گئے۔اختر رضا سلیمی لکھتے ہیں:

رات بارہ بجے کے قریب پوری بستی لرز اٹھی تھی۔ زمین نے چار پانچ ہچکولے کھائے اور پھر ہر طرف لڑی کی بھاری شہتیروں کے ٹوٹنے کی تڑتڑاہٹ اور پتھروں کی گڑگڑاہٹ سنائی دینے لگی۔ لوگ صرف خوابوں کی دنیا سے نہیں ، گھروں سے بھی نکل آئے تھے اور جو کوشش کے باوجود نہیں نکل پائے تھے، انہیں موت نے آلیا تھا۔

نور آباد کی ایک سو تہتر سالہ تاریخ میں تباہی نے دوسری بار اس بستی کا رخ کیا تھا۔ اس سے پہلے آج سے ایک سو چونسٹھ سال قبل ۱۸۴۱ء میں بارشوں نے اس نئی بسی ہوئی بستی پر شب خون مارا تھا۔اور ڈیڑھ درجن کے قریب لوگ لقمۂ اجل بن گئے تھے۔گزشتہ رات ایک بار پھر موت نے اس بستی کا رخ کیا تھا، جو اب تک اچھا خاصا بڑا گاؤں بن چکی تھی۔ رات بارہ بجے کے قریب پورا علاقہ زلزلوں کے شدید جھٹکوں سے لرز اٹھا تھا۔ گاؤں کے پختہ مکانوں میں سے بھی کئی زمین بوس ہو گئے تھے؛ اور کچھ مکانوں میں سے تو کوئی کوئی ہی اپنی بنیادوں پر کھڑا رہ پایا تھا۔ اس چودھویں کے چاند کی برفانی رات میں، سوائے ان لوگوں کے جو ملبے تلے دب گئے تھے ،کوئی بھی اپنے مکان کے اندر موجود نہیں تھا۔۶۵

یہ زلزلہ بروز ہفتہ پیش آیا، جو علاقہ میں دن تھا اور تقریباً سکول اس دوران کام کر رہے تھے۔ اسی وجہ سے یہاں زیادہ اموات سکولوں اور مرنے والوں کی زیادہ تعداد بچوں کی بتائی جاتی ہے۔ زیادہ تر بچے

منہدم ہونے والی سکول کی عمارت میں ملبے تلے دبے ہوئے تھے۔رپورٹوں کے مطابق شمالی پاکستان میں جہاں یہ زلزلہ رونما ہوا ،تقریباً قصبے اور گاؤں صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ جبکہ مضافاتی علاقوں میں بھی بڑے پیمانے پر مالی نقصان ہوا۔ اختر رضا سلیمی لکھتے ہیں:

> ساری وادی نصف رات کے بعد ٹھک ٹھک۔ ٹھاہ ٹھاہ کی آوازوں سے گونجنا شروع ہو گئی تھی۔ ان آوازوں کے ساتھ چیخنے چلانے اور رونے کی آوازیں بھی بلند ہوتی رہی تھیں۔ دوپہر ہونے کو آئی تھی مگر یہ آوازیں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چیخنے چلانے اور رونے پیٹنے کی آوازیں کم ہوتی چلی گئیں کہ پسماندگان کو اب صبر آ ہی گیا تھا۔ جب کوئی نئی لاش ملبے سے برآمد ہوتی تو عورتوں کے بینوں کی آواز بلند ہوتی، جو کچھ ہی دیر جاری رہتی۔آخر وہ بیچاریاں کتنوں کو روتیں۔٦٦

اختر رضا سلیمی نے زلزلے کا وقت آدھی رات کے بارہ بجے کا بتایا ہے۔ حالاں کہ یہ زلزلہ ۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو صبح آٹھ بج کر باون منٹ پر آیا تھا۔لیکن سلیمی صاحب نے واقع کو فکشنائز کرنے کے لیے آدھی رات کا وقت لکھا ہے۔

اس شہر کا نام بھی میجر ایبٹ کے نام سے یعنی ایبٹ رکھا گیا کیونکہ وہ دل و جان سے چاہتے تھے کہ یہ شہر امن وسکون سے رہے اور یہاں انگریز حکومت اپنے منصوبے مکمل کریں۔ ڈاکٹر خان بہادر لکھتے ہیں۔

> یہ شہر میجر جس میں ایبٹ ہزارہ کے پہلے ڈپٹی کمیشنر 1849 تا 1852 کے نام سے موسوم ہے۔ اس کو ایبٹ کے جانشین میجر ایڈوڈ نے آباد کیا اور ایبٹ آباد نام رکھا۔سب سے پہلے چھاؤنی کی تعمیر ہوئی اور ساتھ سرکاری دفاتر اور دیگر عمارات تعمیر ہوئیں۔ میجر ایبٹ کے وقت ضلع ہزارہ کی حکومت کا صدر مقام نواں شہر تھا لیکن ہنگامی حالات میں میجر ایبٹ کا قیام شیروان کے گاؤں کے عقب میں ایک پہاڑی پر ہوتا تھا۔ جہاں اس کے لیے پکا بنگلہ بنا ہوا ہے۔ جس کے آثار۱۹۵۴ء،۱۹۵۳ تک موجود تھے۔٦٧

حوالہ جات

۱۔ بشیر احمد سوز، پروفیسر ہزارہ شعراء کی نظر میں ایبٹ آباد اکے بی پرنٹرز، ۲۰۰۱ء ص ۵۱

۲۔ صادق زاہد، پروفیسر تاثرات و تجزیات لاہور، الحمد پبلی کیشنز چوک پرانا انارکلی لنک روڈ لاہور، ۲۰۰۱ء ص ۳۰۸

۳۔ بشیر احمد سوز ہزارہ شعراء کی نظر میں ص: ۱۸

۴۔ ایضاً، ص: ۲۳

۵۔ شاہ نظر خان زیر خاک لاہور ملت پبلی کیشنز ۲۰۰۲ء ص ۱۵،۱۴

۶۔ ایضاً، ص: ۲۳

۷۔ شیر بہادر خان، ڈاکٹر تاریخ ہزارہ لاہور، مکتبہ جمال ۲۰۰۳ء، ص: ۳۲

۸۔ بشیر احمد سوز پروفیسر ہزارہ شعراء کی نظر میں ص: ۵۳

۹۔ شیر بہادر خان، ڈاکٹر ''تاریخ ہزارہ'' ص: ۵۳

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ محمد خواص خان دیوان راجا بابا راولپنڈی، مجلس علم و ادب، ۱۹۸۷، ص: ۲۹

۱۲۔ اختر رضا سلیمی خواب دان سانجھ پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۳ء، ص: ۶۵

۱۳۔ افتخار احمد، پروفیسر (مترجم) ہزارہ گزیٹر لاہور، مکتبہ جمال، ۲۰۰۶، ص؛ ۲۹

۱۴۔ غلام مصطفیٰ، پروفیسر مانسہرہ تاریخ کے آشنے میں اسلام آباد، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، ۲۰۰۹ء، ص: ۹۱

۱۵۔ ایضاً ص ۹۲

۱۶۔ ایضاً، ص: ۹۲

۱۷۔ ایضاً،ص ۹۳

۱۸۔ شیر بہادر خان، ڈاکٹر ''تاریخ ہزارہ'' ص: ۳۵

۱۹۔ غلام مصطفیٰ، پروفیسر ''مانسہرہ تاریخ کے آئینے میں'' ص:۹۲

۲۰۔ محمد فیاض عزیز، مشہد بالاکوٹ، راولپنڈی، ایس، ٹی پرنٹرز، ۱۹۹۴ء، ص:۳۴

۲۱۔ شیر بہادر خان، ڈاکٹر ''تاریخ ہزارہ'' ص۳۴

۲۲۔ افتخار احمد پروفیسر ''ہزارہ گزٹیئر، ص:۹۳

۲۳۔ ایضاً، ص ۹۸

۲۴۔ شیر بہادر خان، ڈاکٹر ''تاریخ ہزارہ'' ص: ۳۸

۲۵۔ خلیل الرحمان خلیل ہزارہ میں پشتو اور ہندکو کے باہمی اثرات کا جائزہ اسلام آباد، مقالہ برائے ایم فل علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء

۲۶۔ اسد محمد خان، رائے مشمولہ، جاگے ہیں خواب میں اختر رضا سلیمی شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، مارچ ۲۰۱۵ء

۲۷۔ اختر رضا سلیمی جاگے ہیں خواب میں شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، مارچ ۲۰۱۵، ص۱۴

۲۸۔ ایضاً،ص ۱۶

۲۹۔ اختر رضا سلیمی جاگے ہیں خواب میں، ص۳۴

۳۰۔ ایضاً، ص،۴۴

۳۱۔ ایضاً، ص،۱۱۴

۳۲۔ نذر عابد، ڈاکٹر، (خزاں ۲۰۱۲) ناول جاگے ہیں خواب میں کا تجزیاتی مطالعہ سید احمد شہید کی تحریک جہاد کے خصوصی تناظر میں، مشمولہ، تحقیقی مجلّہ اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور

۳۳۔ اختر رضا سلیمی جاگے ہیں خواب میں شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، مارچ ۲۰۱۵، ص،۴۴، ۴۵

۳۴۔ ایضاً،ص،۴۲

۳۵۔ ایضاً،ص،۴۳

۳۶۔ شیر بہادر، ڈاکٹر، تایا سنز پرنٹرز لاہور، ۲۰۱۶، ۶۸

۳۷۔ ایضاً،ص، ۶۸

۳۸۔ ایضاً،ص،۱۰۳،۱۰۴

۳۹۔ اختر رضا سلیمی،جاگے ہیں خواب میں ص،۴۵

۴۰۔ ایضاً،ص،۴۰

۴۱۔ پرتاب سنگھ، تاریخ ہزارہ و عہد سرکار انگریزی دولتمدادو (مترجم) ڈاکٹر بہادر پنی، تایا سنز پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۶،ص،۱۴۴

۴۲۔ ایضاً،ص،۱۴۴

۴۳۔ اختر رضا سلیمی جاگے ہیں خواب میں ص ۴۲

۴۴۔ ایضاً، ۴۷

۴۵۔ پرتاب سنگھ، تاریخ ہزارہ و عہد سرکار انگریزی (مترجم) ڈاکٹر خان بہادر پنی۔ص ۱۴۵

۴۶۔ اختر رضا سلیمی جاگے ہیں خواب میں' ص، ۴۷،۴۸

۴۷۔ مہتاب سنگھ، تاریخ ہزارہ و عہد سرکار انگریزی دولمتداد (مترجم) ڈاکٹر بہادر پنی،ص، ۱۴۶

۴۸۔ مہتاب سنگھ، تاریخ ہزارہ و عہد سرکار انگریزی دولتمداد (مترجم) ڈاکٹر بہادر پنی،ص، ۱۴۷

۴۹۔ شیخ محمد اکرام، موج کوثر، سروسز بک کلب راولپنڈی،ص ۱۳

۵۰۔ اختر رضا سلیمی،جاگے ہیں خواب میں ص،۵۰

۵۱۔ پرتاب سنگھ، تاریخ ہزارہ و عہد سرکار انگریزی (مترجم) ڈاکٹر خان بہادر پنی، ص، ۴۸

۵۲۔ اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں، ص ۴۸

۵۳۔ مہتاب سنگھ، تاریخ ہزار، عہد سرکار، انگریزی دولمتدار (مترجم) ڈاکٹر بہادر دین، ص ۱۴۹

۵۴۔ اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں، ص ۱۴۱۔۱۴۲

۵۵۔ ایضاً، ص ۶۷

۵۶۔ ایضاً، ص ۶۸-۶۹

۵۷۔ ایضاً، ص ۷۰

۵۸۔ ایضاً، ص ۷۰

۵۹۔ ایضاً، ص ۷۱

۶۰۔ ایضاً، ص ۷۲

۶۱۔ شیر بہادر، ڈاکٹر، تاریخ ہزارہ، ص ۲۰۲

۶۲۔ ایضاً، ص ۲۰۳

۶۳۔ اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں، ص ۷۲

۶۴۔ شیر بہادر خان، ڈاکٹر، تاریخ ہزارہ، ص ۱۹۹

۶۵۔ اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں، ص ۷۰

۶۶۔ ایضاً، ص ۳۰

۶۷۔ شیر بہادر خان، ڈاکٹر، تاریخ ہزارہ، ص ۷۸

۵۱۔ پرتاب سنگھ، تاریخ ہزارہ و عہد سرکار انگریزی (مترجم) ڈاکٹر خان بہادر پنی، ص، ۴۸

۵۲۔ اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں، ص ۴۸

۵۳۔ مہتاب سنگھ، تاریخ ہزار، عہد سرکار، انگریزی دولمتدار (مترجم) ڈاکٹر بہادر دین، ص ۱۴۹

۵۴۔ اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں، ص ۱۴۱۔۱۴۲

۵۵۔ ایضاً، ص ۶۷

۵۶۔ ایضاً، ص ۶۸-۶۹

۵۷۔ ایضاً، ص ۷۰

۵۸۔ ایضاً، ص ۷۰

۵۹۔ ایضاً، ص ۷۱

۶۰۔ ایضاً، ص ۷۲

۶۱۔ شیر بہادر، ڈاکٹر، تاریخ ہزارہ، ص ۲۰۲

۶۲۔ ایضاً، ص ۲۰۳

۶۳۔ اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں، ص ۷۲

۶۴۔ شیر بہادر خان، ڈاکٹر، تاریخ ہزارہ، ص ۱۹۹

۶۵۔ اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں، ص ۷۰

۶۶۔ ایضاً، ص ۳۰

۶۷۔ شیر بہادر خان، ڈاکٹر، تاریخ ہزارہ، ص ۷۸

بابِ چہارم

ناول کا تہذیبی مطالعہ

اختر رضا سلیمی کے ناولوں کا تہذیبی مطالعہ:

گندھارا تہذیب کا شمار دنیا کی قدیم اور اعلیٰ تہذیبوں میں ہوتا ہے۔ اس تہذیب کا مرکز ''ٹیکسلا'' تھا۔اس تہذیب کے مظاہر پشاور اور چارسدہ میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ٹیکسلا جو کہ اس تہذیب کا مرکز تھا اس کا پرانا نام''ٹکساشلا'' تھا۔اس تہذیب کا ذکر اختر رضا سلیمی نے ناول میں بھی کیا ہے۔'' ٹکسا'' سنسکرت میں کالے ناگ کو کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں کے قدیم باشندے ناگ کی پوجا کرتے تھے۔ جو کہ آریاؤں کی آمد سے پہلے اس مقام پر آباد تھے اور آریاؤں نے حملے کے بعد یہاں قبضہ کر لیا۔ ٹیکسلا کے قدیم آثار راولپنڈی سے بیس میل کے فاصلے پر شمال مغرب کی طرف ایک سرسبز و شاداب وادی میں واقع ہیں۔ ماہرین کے اندازے کے مطابق اڑھائی ہزار سال قبل جب یہ شہر علم و ادب کا بڑا مرکز تھا تو تین بڑے راستے اس شہر میں داخل ہوتے تھے۔ایک راستہ مغرب یعنی یورپ سے،دوسرا ایشیائی ممالک سے اور تیسرا راستہ باختر اور پشکلاوتی سے گزرتا ہوا دریائے سندھ کو عبور کر کے ٹیکسلا کے مقام پر ختم ہو جاتا۔ اس کے علاوہ ایک رستہ سری نگر، بارہ مولا، ہری پور سے ہوتا ہوا ٹیکسلا پہنچ کر مذکورہ بالا دو راستوں میں مل جاتا۔ اسی طرح کے ایک راستے کا ذکر اختر رضا سلیمی نے اپنے نئے ناول جندر میں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

> یہ راستہ جو اب اتنا تنگ ہو چکا ہے کہ یہاں سے گزرنے والا بہ مشکل اپنے کپڑوں کو جھاڑیوں میں الجھنے سے بچاتا ہے، تب خاصا چوڑا ہوا کرتا تھا۔ سرکاری نقشے میں، یہ اب بھی جنگل سے لے کر قصبے تک پورے گیارہ فٹ ہے، مگر عدم گزران کے سبب اس کا حقیقی وجود سکڑ کر فٹ بھر ہی رہ گیا ہے۔ یوں تو یہ راستہ صدیوں سے موجود ہے اور ایک روایت کے مطابق یہ کسی دور میں کشمیر کو ٹیکسلا سے ملاتا اور نیپال اور ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے تعلق رکھنے والے طالب علم، اس رستے سے گزر کر ٹیکسلا یونیورسٹی میں پڑھنے جایا کرتے تھے لیکن اسے آج سے کوئی صدی بھر پہلے انگریزوں نے سرکاری جنگل میں آمد و رفت کے لئے ہموار کیا تھا اور اس کی چوڑائی گیارہ فٹ مقرر کی تھی۔(۱)

اکثر و بیشتر اسی طرح کے شہر تہذیب و تمدن کے مراکز بنتے ہیں جو تجارتی راستوں میں واقع ہوتے ہیں اور بہت سارے راستے وہاں آ کر ملتے ہیں۔ٹیکسلا کی یہی تجارتی اہمیت اس کی بین الاقوامی شہرت اور

تہذیبی مرکزیت کا سبب بنی۔دنیا کی قدیم مذہبی کتابیں رگ وید اور مہا بھارت بھی اسی سرزمین پر تصنیف ہوئی۔

مہا بھارت کا ذکر سنسکرت کی پرانی کتابوں میں بھی ملتا ہے ۔سنسکرت زبان کی پہلی گرائمر کی پہلی کتاب پاننی نے لکھی تھی۔اس کی کتاب میں بھی مہا بھارت کا ذکر واضح ملتا ہے۔ وہ تقریباً چھٹی صدی قبل مسیح میں تعلیم حاصل کرتا تھا ۔ اس کی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دور چھٹی صدی قبل مسیح کا دور ہے۔ٹیکسلا علم و ادب کا بہترین مرکز تھا ۔ جہاں طالب دور دور سے علم حاصل کرنے آیا کرتے تھے اور ویدوں اور دوسرے علوم میں مہارت حاصل کیا کرتے تھے۔ اپنشد میں دی گئی کتابوں کی فہرست سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ٹیکسلا کے تعلیمی اداروں میں تاریخ ، وید کی گرائمر، اخلاقیات ، ہندسہ ،شگون اور موسیقی کی تعلیم دی جاتی تھی۔اس وقت یونان کے بعد ٹیکسلا کی تعلیم معیاری تھی۔آریائی تہذیب اگرچہ جلد ختم ہوئی لیکن ان کے مذہبی زبان سنسکرت اور پراکرتوں بالخصوص فروتی اور شورسنی کے اثرات برصغیر کی باقی زبانوں پر اثر انداز ہوئے۔آریاوں کی شاخ جب ہندوستان میں گھل مل گئے اور اپنے آپ کو ہندوستانی تصور کیا تو اسی زمانے میں آریاوں کی وہ شاخ جو ایران میں آباد ہوئی تھی ہخامنشی خاندان کے فرمانرواں کی سرکردگی میں جنگ کرنے پہنچ گئی۔کوروش اعظم کا لشکر فارس سے بابل کی عظیم سلطنت کو پامال کرتا ہوا پشاور تک آ گیا تھا۔اس کے جانشین داریوش نے پہلے گندھارا پر قبضہ جمایا اور پھر وادی سندھ کے پورے علاقے کو فتح کر لیا اور اپنی سلطنت میں صوبوں کی حیثیت سے شامل کر لیا ۔ یوں آریائی تہذیب کے بعد ایرانی تہذیب یہاں پروان چڑھنے لگی۔مگر ایرانی بادشاہوں نے مقامی باشندوں کی طرز معاشرت میں مداخلت نہیں کی ۔ ایرانی تسلط کے دور میں ہی ٹیکسلا نے خوب ترقی کی ۔ کیونکہ ٹیکسلا دارالسلطنت تھااس وجہ سے یہاں تین تہذیبوں کا امتزاج تھی ہندوستانی، ایرانی اور یونانی تہذیبوں نے اس علاقے کو ایک کثیر تہذیبی (multi-cultural) علاقہ بنایا۔ اس زمانے میں ٹیکسلا کی شہرت دور دور تک پھیل گئی جس کی وجہ سے ہر علاقے کے طلباء حصولِ تعلیم کے لئے اس شہر میں آنا شروع ہوئے۔اس وقت ٹیکسلا برصغیر کا بڑا تعلیمی مرکز تھا جہاں برہمن نوجوان ، راجے ، مہاراجے اور امراء تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔ ٹیکسلا کی درس گاہوں کو بڑے بڑے گیانی پنڈت اپنی نگرانی میں چلاتے تھے۔یہ درس گاہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے مخصوص تھیں ۔ راج کماروں کے لئے الگ درس گاہیں ہوتی تھیں جس میں بچوں کو فوجی تربیت دینے

کے لئے ایک کالج بھی تھا۔ جہاں سے وہ فن حربیات سیکھا کرتے تھے۔اس کے علاوہ بکثرت درسگاہیں تھیں جن میں معاشیات، تیر اندازی ، قانون ، طب ،فنون لطیفہ، اور دوسرے علوم سکھائے جاتے تھے۔تعلیمی و تہذیبی مرکز کی وجہ سے یہ شہر ایک بین الاقوامی شہر بن گیا۔ اس علاقے پر جب اشوک اعظم کی حکومت بنی تو بھی ٹیکسلا کا مقام بدستور بحال تھا۔ اختر رضا سلیمی نے ناول میں اس زمانے کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں:

> آنند جو فلسفہ ، نجوم ،تقویم ، ریاضی ، اتہاس، قانون، جغرافیہ، سیاست ، طب ، فلکیات، حتیٰ کہ فن حرب،عطر کشی، شراب کشی، سنگ تراشی، سکہ سازی اور گھڑ سواری جیسے متنوع علوم وفنون کا استاد مانا جاتا ہے اور ایک عرصے تک ٹیکسا شلہ یونیورسٹی میں ان میں سے بیشتر علوم کی باقاعدہ تعلیم بھی دیتا رہا ہے۔(۲)

قدرت اللہ فاطمی اپنے مضمون پاکستانی ثقافت کی بنیادیں میں ٹیکسلا یونیورسٹی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> چھٹی صدی قبل مسیح میں ٹیکسلا (ٹیکشلا ،ٹکشیشلا) یونیورسٹی کے قیام کے بعد ٹیکسلا اپنی تاریخ کے بلند ترین مقام تک پہنچ گیا۔ یہ یونیورسٹی تاریخ انسانی کی قدیم ترین اور منفرد درس گاہوں میں سے ایک ہے۔ اس یونیورسٹی نے مہاتما بدھ کے پیغام کو وسطی ایشیا اور مشرق بعید تک پہنچایا اور بدھ کے مہاین مکتبہ فکر کے قیام میں نمایاں کردار ادا کیا۔مہاین مکتبہ فکر کی تاریخ ہندوستانی زرتشتی ،مسیح عارفانہ اور یونانی عناصر کے وسیع تر باہمی اشتراک سے عبارت ہے (مشترکہ نظریات کا یہ اشتراک ٹکشلا متنوع ماحول میں نمو پذیر ہوا) ٹیکشلا مہاین مکتبہ فکر کے عظیم علمی کارناموں کا مرکز تھا۔(۳)

برصغیر میں ہخامنشی عہد کے بعض تہذیبی ورثوں کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے ۔ برصغیر کے لوگ اسی دور میں فن تحریر سے آشنا ہوئے۔ اس زمانے میں ایران کی سرکاری زبان کا رسم الخط آرامی تھا۔ اس وجہ سے اس رسم الخط نے ٹیکسلا سمیت ہندوستان کے دیگر دیگر علاقوں میں رواج پایا۔ برصغیر کی تقریباً ساری زبانوں کے رسم الخط کی بنیاد یہی آرامی رسم الخط ہی ہے۔ ہخامنشی سلطنت اس حوالے سے بھی اہمیت کا حامل ٹھہرا کہ برصغیر کی پہلی ملک گیر سلطنت اسی طرز حکومت پر قائم کی گئی تھی۔ کوٹلیہ جو چندر گپت کا ایک اہم وزیر تھا۔ اس کی مشہور کتاب ارتھ شاستر میں حکومت کرنے کے لئے جو طریقے سکھائے گئے وہ طریقے ہخامنشی

حکومت کے تحریروں سے ماخوذ ہیں۔ ہخامنشی حکومت کا یہ طریقہ کار تھا کہ شاہی احکام کو بڑی شاہراہوں کے قریب چٹانوں پر کندہ کرواتے تھے۔ یہی طریقہ بعد میں اشوک اعظم نے اختیار کیا جس کا ذکر اختر رضا سلیمی نے ناول میں کیا ہے۔۔ یہ فرامین زیادہ تر نفس پر قابو پانے اور عدم تشدد کے بارے میں ہوتے تھے ۔ مہاراجہ نے جب بدھ مت قبول کیا تو اپنے گناہوں کے کفارے کے لئے ریاست میں بڑے پیمانے پر فلاحی کام کیے۔ کنویں کھودنے ، راستوں پر سرائے بنائے گئے، اور مشہور شاہراہوں پر لوگوں کی تر بیت کے لئے فرامین کندہ کروائے گئے ۔ ان فرامین میں سے چودہ فرامین ابھی تک دریافت ہو چکے ہیں ۔ اس میں سے ایک فرمان اختر رضا سلیمی کے ناول میں یوں بیان کی گئی ہے:

> مہاراجہ کی خواہش ہے کہ ہر جگہ پر طبقے کے لوگ اطاعت گزار ہیں کیوں کہ ہر کوئی چاہتا ہے کہ وہ اپنے حواس پر قابو رکھے اور اس کا ذہن پاک صاف رہے۔ البتہ مردوں کو اپنی خواہشات اور پسند پر قابو نہیں رہتا۔ کچھ لوگ احکامات پر پورا پورا عمل کریں گے اور کچھ جزوی طور پر۔ حتیٰ کہ کسی ایسے شخص کے نزدیک بھی ، جو مکمل طور پر آزاد روی کا قائل ہو، اپنے حواس کو قابو رکھنا ، ذہن کی پاکیزگی، احسان مندی اور وفاداری ہمیشہ قابل تعریف رہی ہیں۔(۴)

ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کی یہ عبارت خروشتی رسم الخط میں ہے۔ جو ساتویں صدی عیسوی تک ٹیکسلا میں مروج رہا۔ بعد میں اسی رسم الخط کی جگہ دیوناگری نے لے لی۔

ڈاکٹر کلیم جو اختر رضا سلیمی کے ناول کا ایک کردار ہے اور جو قدیم زبانوں کا ماہر ہے ، کہتا ہے:

> یہ مہاراجہ اشوک کا ساتواں فرمان ہے۔ اس نے اپنے دور حکومت میں کئی فرمان کندہ کرائے۔ جن میں سے چودہ فرمان مانسہرہ میں بریڑی کے مقام پر دریافت ہو چکے ہیں ۔ یقیناً ایسے فرمان یہاں اور چٹانوں پر بھی موجود ہوں گے۔(۵)

تعلیم دینے کے جگہ جگہ سکول بنانے کا طریقہ بھی ہخامنشی عہد میں شروع ہوا۔ برصغیر کے مختلف علاقوں میں اس کے آثار موجود ہیں۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں ہخامنشی سلطنت کافی حد تک کمزور ہو گئی تھی ۔ برصغیر میں اس کا اقتدار اب پہلے کی طرح مضبوط نہیں تھا۔ تیزی کے ساتھ اس حکومت کی گرفت کمزور ہو

رہی تھی ۔ اسی دور میں مغربی گندھارا پشکلاوتی اور مشرقی گندھارا میں ٹیکسلا نے بغاوت کر کے خود مختار ریاستیں قائم کیں۔ ۳۲۷ قبل مسیح میں سکندر اعظم نے وادی سندھ پر حملہ کیا تو چونکہ مرکزی حکومت ختم ہو چکی تھی اس وجہ سے کسی نے بھی مزاحمت نہیں کی ۔ اگر چہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں موجود تھیں لیکن ان میں یہ سکت نہ تھی کہ سکندر اعظم کا مقابلہ کر سکیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یونان عروج پر تھا۔ افلاطون کا شاگرد ارسطو بھی زندہ تھا اور سکندر اعظم کی استادی پر معمور تھا ۔ ناول کا مرکزی کردار زمان چونکہ کوما میں اشوک اعظم کے دور تک سفر کرتا ہے۔ اس وجہ سے جب وہ ہوش میں آتا ہے تو تو حیران ہو جاتا ہے ہے کیونکہ وہ ذہنی طور پر اشوک کے دور میں تھا ۔ جدید عمارات اور سڑک پر دوڑتی ہوئی گاڑیاں دیکھ کر اسے اپنے ساتھی کا ایک جملہ یاد آتا ہے جو شاہ انطوکس کے لئے خیر سگالی کا پیغام لے کر گیا تھا۔ اس نے واپس آ کر یونان کے بارے میں حیرت انگیز باتیں بتائی تھیں۔''یونان بہت ترقی یافتہ ملک ہے۔ وہاں بڑی بڑی عمارتیں ہیں اور سڑک بہت چوڑی ۔''(۶)

سکندر اعظم نے یونان کے دو ریاستوں ایتھنز اور سپارٹا جو اکثر باہم لڑتے رہتے تھے ، متحد کیا اور اس کے بعد فتوحات کا آغاز کیا۔ ان فتوحات کا سلسلہ ہندوستان تک پہنچ گیا۔ ۔ ایک طرف ٹیکسلا پشکلاوتی اور جہلم کے ترقی یافتہ باشندے تھے تو دوسری طرف پرانے مقامی باشندوں کی وحدتیں تھیں جس میں عداوت و دشمنی چل رہی تھی۔ کیونکہ مقامی باشندوں کے رسوم و رواج، عقائد اور تہذیب وغیرہ آریاوں سے مختلف تھے۔ اس وجہ سے غیر ملکی حملہ آوروں کے مقابلے کے بجائے ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لئے حملہ آور کا ساتھ دیتے۔ جس کی وجہ سے غیر ملکی حملہ آوروں کو مزاحمت کا سامنا کم سے کم رہتا۔ ٹیکسلا کے راجہ نے سکندر سے صلح کر لی تھی جس کی وجہ سے اس کی سلطنت محفوظ رہی۔ مگر راجہ پورس نے سکندر کا مقابلہ دریائے جہلم کے کنارے پر کیا۔ مگر وہ نا کام ہوا اور اس کے لشکر کو شکست ہوئی۔ ۳۲۵ قبل مسیح میں سکندر براستہ سندھ واپس برصغیر سے نکل گیا۔ اگر چہ سکندر نے برصغیر میں مختصر عرصہ گزارا مگر اس کے حملوں نے برصغیر کی تاریخ و تہذیب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

سکندر کے جانے کے بعد ہندوستان بدستور ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا اس عرصے میں موریہ سلطنت کے بانی چندر گپت موریہ نے ہندوستان کو ایک مرکزی حکومت کے تحت لانے کے لئے فتوحات کا آغاز کیا ۔اور چندر گپت موریہ اس طرح ایک طاقت ور حکمران بن گیا۔ ماہرین تاریخ بیان کرتے ہیں کہ سکندر اعظم کے

جانے کے بعد پنجاب میں سیاسی انتشار، بے چینی اور افراتفری کا عالم تھا۔ مگدھ سلطنت جس کی بنیاد ۳۴۴ قبل مسیح میں نند خاندان نے رکھی تھی ۔ اس کا دارالسلطنت بہار تھا۔ مگدھی سلطنت کے راجہ نے اپنے سپہ سالار چندر گپت سے ناخوش ہو کر اسے جلا وطن کر دیا تھا۔ اس دوران وہ چانکیہ سے جا ملا ۔ دونوں نے مل کر نند خاندان کا خاتمہ کر کے مگدھ سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ چندر گپت موریہ نے مگدھ سلطنت سے نند خاندان کا خاتمہ کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان نامہ کر دیا۔ اس نے صرف مگدھ سلطنت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پورے ہندوستان پر حکومت کی کوششیں شروع کر دیں۔ اپنے اس خواب کی تکمیل کے لیے اس نے سکندر اعظم کے جانشین کو جو شمال مغرب میں طاقت ور حکمران تھا، شکست دے کر وادی سندھ اور افغانستان کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ توسیع پسندانہ عزائم رکھنے والے چندر گپت کی موریہ سلطنت خلیج بنگال سے بحیرۂ عرب تک پھیل گئی۔ اس کے دور حکومت میں وادی گنگا سیاست و تہذیب کا مرکز بن گئی۔ چندر گپت موریہ کی کامیابی میں چانکیہ کی راہنمائی کا بڑا عمل دخل تھا۔ اسی کے مشوروں اور رہنمائی میں اس نے برصغیر میں ایک بڑی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ مسعود الحسن خان صابری چندر گپت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> سکندر کے بعد پنجاب میں یونان کے خلاف بغاوت ہوگئی۔ چندر گپت نے اپنے اتالیق اور مشیر چانکیہ کی مدد سے بہت سے افواج اکٹھی کر کے یونانیوں کو شکست دی۔۔ انہیں پنجاب سے باہر نکال کر پنجاب کے بہت سے حصے پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے مگدھ کی ریاست پر بھی حملہ کر دیا اور راجہ دھن نند کو تخت سے اتار کر خود بادشاہ بن گیا اور موریہ خاندان کی بنیاد ڈالی اور پھر شمال ہند کی بہت سی ریاستوں کو فتح کر کے ایک مضبوط اور وسیع سلطنت کی بنیاد ڈالی۔(۷)

مسلسل فتوحات ہونے کی وجہ سے اب چندر گپت کی فوج خاصی طاقت ور ہوتی گئی۔ فوج کے سربراہ کو سنیاسی کہا جاتا تھا۔ اہم عہدہ داروں میں وزراء، پروہت، مشیر، دربان، اور خزانچی مقرر کیے۔ لوگوں کی نگرانی کے لئے اس نے جاسوسی نظام بھی بنایا۔ اس نے کسانوں، زمینداروں اور کاریگروں سے ٹیکس وصول کرنا شروع کر دیے۔ چندر گپت کے دور میں جرائم کے مرتکب ہونے پر سزا بہت سخت دی جاتی تھی۔ چونکہ ہندوستان ایک زرعی ملک ہے اس وجہ سے کھیتی باڑی کی ترقی کے لئے اس نے آب پاشی کا نظام بہتر کیا اور ہر شہر کی دیکھ بھال کے لئے کمیٹیاں تشکیل دی گئیں جو شہر کے مسائل پر نظر رکھتی تھیں۔ چندر گپت کی

وفات کے بعد اس کا بیٹا بادشاہ بنا جس نے تقریباً ۲۸ سال تک کامیاب حکومت کی ۔ اس کے بعد اس کا پوتا اشوک اعظم تخت نشین ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب گوتم بدھ اپنی تعلیمات کا پرچار کر رہا تھا جو عدم تشدد، پیار محبت، اور نفس و خواہشات پر قابو پانے کی دعوت تھی۔ لوگ تیزی سے گوتم بدھ کے افکار کو قبول کر رہے تھے کیونکہ گوتم بدھ کی تعلیمات فطری تھیں اور اس وقت کی ضرورت بھی۔ اشوک اعظم کی سلطنت میں بھی یہ تعلیمات تیزی سے پھیل رہی تھیں اور لوگ انہیں قبول کر رہے تھے۔ ہندو مت کو ہندوستان میں بدھ مت نے ہی پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا۔ اشوک نے بھی بعد میں اس مذہب کو قبول کیا۔

اشوک چندر گپت کا پوتا موریہ خاندان کا مشہور بادشاہ تھا۔ اس نے ہندوستان پر چالیس سال تک حکومت کی۔ اس کے باپ نے اس کو ٹیکسلا اور اجین کے صوبوں کا حاکم مقرر کیا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد اشوک اپنے باپ کے تخت پر تخت نشین ہوا۔ اشوک کے بادشاہ بننے کے وقت تمام برصغیر موریہ سلطنت میں شامل تھا۔ لیکن کلنگ (اڑیسہ) کا علاقہ کسی اور راجہ کے قبضے میں تھا۔ اشوک نے اسے فتح کرنے کے لیے حملہ کیا اور ایک خونریز جنگ کے بعد وہ علاقہ فتح کر لیا۔ اس طرح اس کی حکومت کی یہ خواہش بھی پوری ہو گئی ۔ اس جنگ میں بڑے پیمانے پر قتل و غارت ہوئی اور ہزاروں لوگ میدان جنگ میں مارے گئے ۔ اشوک اعظم نے جب یہ سب کچھ دیکھا تو اس میں اداسی کی ایک کیفیت پیدا ہوئی اور اسے جنگ سے نفرت ہونے لگی۔ اس نے ارادہ کیا کہ آئندہ جنگ نہیں لڑے گا۔ اس نے گوتم بدھ کی تعلیمات پر عمل کیا۔ نہ صرف اسے قبول کیا بلکہ اس کی تبلیغ کے لئے اقدامات بھی کیے۔ اس کے عمل کا فائدہ بدھ مت کو یہ ہوا کہ بدھ مذہب چارسو پھیل گیا ۔ اس کی ایک وجہ عربی مقولے سے عیاں ہو جاتی ہے کہ 'الناس علی دین ملوکھم' یعنی لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے اشوک اعظم کے دور کی تصویر کشی خوب کی ہے۔ مثلاً جب زمان اشوک اعظم کے حکم پر چٹانوں پر عبارت کندہ کر رہا ہوتا ہے سوچتا ہے:

> اگر مہاتما بدھ کی پھیلائی ہوئی روشنی ہم تک نہ پہنچتی تو مہاراجہ حضور ملک کا لنگاس کی طرح دوسرے ملکوں میں بھی لاکھوں لوگوں کو قتل کروا رہے ہوتے اور میں آج اپنے ساتھیوں کے ساتھ بے گناہ لوگوں کے گھروں پر شب خون مار رہا ہوتا۔(۸)

مہا تما بدھ نے نروان کی تعلیم دی یعنی انسان کو چاہیے کہ نفس کی خواہشات کو مکمل طور پر ختم کرے جس کو نروان کہا جاتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار زمان کہہ رہا ہے'' مہا تما کی تعلیم نے مجھے اپنی ذات کا

عرفان بخشا۔ اگر وہ نہ ہوتے تو میں بھی ذات کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا ہوتا'' (۹)

اور پھر زمان آگے کہتا ہے نروان ہی سب کی منزل ہے ۔اور نروان ہی میری منزل ہے ۔ اشوک نے جب مہاتما بدھ کی تعلیمات کو قبول کیا تو اس کی زندگی میں ایک انقلاب آیا۔ اس کے بعد امن و امان ، صلح و رواداری، اور اپیار و محبت کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے ہوئے اپنی رعایا کے فلاح و بہبود کے لیے کام کیے۔ اس نے بدھ مت کے فروغ کے لئے نا صرف برصغیر میں بلکہ ہمسایہ ممالک میں بھی اسٹوپ تعمیر کرائے۔ جس میں سانچی کا اسٹوپ زیادہ معروف ہے۔ اشوک نے ایک ایسے ملک میں جہاں درجنوں مذاہب موجود تھے مذہبی رواداری کی تعلیم دی۔ وہ مذہب کی سچائی پر یقین رکھتا تھا۔ اس وجہ سے ہر مذہب اور عقیدے کا احترام کرتا تھا۔ خود اشوک اعظم مہاتما کی تعلیمات پر یقین رکھتا تھا۔ مہاتما کی تعلیمات آنند جو بدھ مذہب کا ایک بڑا عالم تھا اور ٹیکسلا یونیورسٹی میں پڑھا کرتا تھا دیا کرتا تھا۔ اختر رضا سلیمی نے مہاتما بدھ کے فلسفہ مذہب کو یوں نقل کیا ہے:

پیدائش سے جسم وجود پاتا ہے

جسم سے ذہن جنم لیتا ہے

ذہن سے شعور جنم لیتا ہے

شعور سے حواس جنم لیتے ہیں

حواس سے اشیا کا ادراک جنم لیتا ہے

اشیا کے ادراک سے وابستگی جنم لیتی ہے

وابستگی سے خواہش جنم لیتی ہے

خواہش سے دکھ جنم لیتا ہے

لہذا تمام انسان دکھ میں مبتلا ہیں۔

جنم چکر کے خاتمے سے جسم تحلیل ہوتا ہے

جسم کی تحلیل سے ذہن کا خاتمہ ہوتا ہے۔

ذہن کے خاتمے سے شعور کا خاتمہ ہوتا ہے۔

شعور کے خاتمے سے حواس ختم ہوتے ہیں۔

حواس کے خاتمے سے چیزوں کا ادراک ختم ہوتا ہے۔

ادراک کے خاتمے سے وابستگی ختم ہوتی ہے۔

وابستگی کے خاتمے سے خواہش ختم ہوتی ہے۔

خواہش کے خاتمے سے دکھ سے نجات ملتی ہے۔

دکھ کے خاتمے سے پانچوں حواس چھٹی حس میں جمع ہو جاتے ہیں جس سے تیسری آنکھ جنم لیتی ہے۔ تیسری آنکھ سے وہ سب کچھ دیکھا جا سکتا ہے جو مایا جال سے ادھر ہے(۱۰)

دھم دھرم (یعنی زندگی گزارے کا طریقہ) کے فلسفے نے برصغیر کی تہذیب پر گہرے اثرات ڈالے۔ اگرچہ ملک میں سیاسی تبدیلیاں آتی رہیں لیکن لوگ دھرم کے ساتھ وابستہ رہے۔ اشوک نے دھرم کے فلسفے کو پھیلانے اور لوگوں میں اسے مقبول بنانے کے لئے اس کے اہم اصول و قوانین ، مہاتما کے فرامین ، ہدایتوں اور نصیحتوں کو چٹانوں ، ستونوں اور پتھروں پر کندہ کروانے کے علاوہ کھجور کے پتوں پر لکھوا کر لوگوں میں پھیلایا۔ جس کا ذکر اختر رضا سلیمی نے ناول میں بھی کیا ہے۔ان اصولوں اور قوانین وغیرہ کو سرکاری عہدے دار لوگ کو پڑھ کر سناتے تھے اور ساتھ عمل کی بھی تلقین کرتے۔ یہ فرامین تحریر کے علاوہ زبانی بھی ہوتے تھے۔ اشوک کے حکم پر لکھے ہوئے کتبے مختلف زبانوں میں ہیں جن میں پراکرات ، ایرانی ،تورانی ، اور یونانی قابل ذکر ہیں۔ ان کتبوں کو چار رسم الخط میں لکھا گیا تھا۔ براہمی، فروشتی ، آرامی اور یونانی ۔ اس کے کتبے افغانستان سے لے کر کرناٹک تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کتبوں میں جو زبانیں استعمال ہوئی ہیں وہ سادہ اور آسان ہیں کیونکہ یہ عوام الناس کے لیے تھے۔ان کے موضوعات میں سماجی ، سیاسی ، معاشی، احکامات اور مذہب کی ہدایات ہیں۔ یہ کتبے چونکہ پتھروں پر کندہ کرائے گئے تھے اس لئے ان کی عبارتیں اب تک محفوظ حالت میں ہیں اور ان کی عبارت میں ردو بدل بھی نہیں ہو سکتا۔ان کی دریافت بیسویں صدی میں ہوئی اور ماہرین نے انہیں پڑھ کر ان کی مدد سے اشوک کے عہد کے عقائد و

خیالات کی پالیسی کو لکھا۔

اشوک کی سلطنت بہت وسیع تھی اس کو متحد رکھنے کے لیے اور ٹوٹنے سے بچانے کو لیے جو پالیسی اختیار کی گئی وہ مذہبی رواداری اور مختلف تہذیبوں کی امتزاج کی تھی۔اشوک کے دور میں گندھارا تہذیب کی تمدنی ترقی یعنی شہروں کو آباد کرنے کی طرف خاص توجہ دی گئی ۔ کیونکہ ملک میں امن و امان کی وجہ سے تجارت ترقی کر رہی تھی خاص کر ہنر مند لوگوں کی بڑی مانگ تھی۔ اشوک نے مذہبی رواداری کو فروغ دیا جس کی وجہ اس وسیع سلطنت میں امن و امان تھا۔

اشوک دور میں دارالسلطنت پاٹلی پتر تھا۔ یہ شہر حفاظتی دیوار وں سے محفوظ کیا گیا تھا۔رات کے وقت شہر کے دروازے بند کر دئے جاتے تھے تا کہ جرائم پیشہ لوگوں کی وارداتوں سے محفوظ رہا جا سکے۔ دوسرے شہروں کے مقابلے میں پاٹلی پترایک گنجان آباد اور تمدن یافتہ شہر تھا۔اشوک اعظم نے پاٹلی پتر کے علاوہ دوسرے شہر بھی آباد کیے۔ ان میں ٹیکسلا ، اجین ، اور متھرا جیسے خوبصورت شہر شامل تھے۔اشوک نے بدھ مت کے پیرو کاروں کے لیے لاتعداد عبادت خانے یعنی اسٹوپ اور خانقاہیں تعمیر کروائیں۔ اس کے علاوہ مختلف عوامی شاہراہوں پر جانوروں کے مجسمے نصب کروائے ۔عوامی راستوں پر جگہ جگہ کنویں اور سرائے کے ساتھ ساتھ سایہ دار درخت بھی لگوائے۔اس کے علاوہ اس نے ملک بھر میں شفا خانوں کی تعمیر کا سلسلہ بھی شروع کیا۔کھنڈرات سے اشوک دور کے بیش قیمت سکے بھی دریافت ہوئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موریہ سلطنت میں امن و امان کی وجہ سے تجارتی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔

اشوک اعظم کے دور میں سلطنت دنیا کے خوشحال ترین علاقوں میں شامل ہو چکی تھی۔ اس کے دور میں نہ تو کوئی بیرونی حملہ آور آیا اور نہ ہی کسی قسم کا اندرونی خلفشار پیدا ہوا۔موریہ سلطنت تقریباً تمام برصغیر پر پھیلی ہوئی تھی۔ ہندوکش سے لے کر میسور تک کا تمام علاقہ اس سلطنت کے ماتحت تھا۔لیکن موریہ سماج میں بڑے پیمانے پر ہندو بھی موجود تھے جن کے معاشرتی نظام میں ذات پات کی تقسیم کا مضبوط نظام موجود تھا۔حکمران طبقوں میں شاہی خاندان کے افراد ، سرکاری عہدیدار، زمیندار اور امراء شریک تھے۔راجہ بکرماجیت نے اپنے دور میں شعراء، فنکاروں ،علماء اور دیگر ہنر مندوں کی سرپرستی بھی کی۔

گپت دور میں برہمن جو جین مت اور بدھ مت کے آنے کے بعد کمزور ہو گئی تھی دوبارہ مضبوط ہونا شروع ہوا لیکن اتنے عرصے میں بدھ مذہب اور جین مت کے بہت سے اثرات اس میں شامل ہو گئے تھے۔

گپت دور میں مشہور یونیورسٹی نالندہ پٹنہ کے قریب تھی ۔ اس دور میں دور دور سے طلباء پڑھنے آتے تھے۔ اس دور میں درباری اور سرکاری زبان سنسکرت تھی ۔مشہور کتاب پنچ تنتر اسی دور میں لکھی گئی ۔جس کا ترجمہ مختلف ادوار میں ،مختلف زبانوں اور مختلف ممالک میں ہوتا رہا جو کہ آج کلیلہ و دمنہ کے نام سے عام جانی جاتی ہے۔ اس زمانے کا معاروف شاعر کالی داس تھا جس کی نظمیں اور ناٹک خاصے مقبول ہوئے۔

اشوک اعظم کی وفات ۲۳۲ قبل مسیح میں ہوئی۔ اس کے بعد اس کے جانشین اس قابل نہ تھے کہ اتنی بڑی سلطنت کو سنبھال سکتے۔ جگہ جگہ سے بغاوتیں ہوئیں۔حکمران بدعنونیوں میں ملوث ہوئے۔ مرکزی حکمرانی کے لیے لڑائی جھگڑے شروع ہوئے۔جس کی وجہ سے دور دراز علاقوں پر کنٹرول ختم ہوتا گیا۔موریہ سلطنت کے بعد برصغیر میں چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہوئیں۔

موریہ دور کی ترقی کا ذکر اختر رضا سلیمی کے ناول میں بھی ملتا ہے۔ خاص کر ٹیکسلا علم و ادب کا مرکز ٹھہرا جس میں ایک عظیم الشان یونیورسٹی بنی۔ اس یونیورسٹی میں طلباء دور دور سے پڑھنے آتے تھے ۔ اس سلطنت میں اگر چہ مذہبی رواداری قائم تھی لیکن سب کچھ بدھ مت کے زیر اثر تھا جو اشوک کا مذہب تھا اس وجہ سے بدھ مت کو پھیلنے سے کسی نے نہیں روکا۔ یہ امن و آشتی کا مذہب تھا یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں نیپال کے علاوہ ہندوستان ، چین ، جاپان اور دوسرے ممالک میں لوگوں نے اس مذہب کو اختیار کیا۔اس دور کے آثار میں اسٹوپ قابل ذکر ہیں اور ساتھ اشوک کے حکم پر تراشے ہوئے کتبے اب تک موجود ہیں جس پر اس نے عوام کے لیے مذہبی احکامات لکھوائے تھے۔ اس کے علاوہ اجنٹا اور ایلیورا کے غار جنہیں اس دور میں اور اس کے دور سے پہلے بادشاہوں اور راجاؤں نے بنوائے تھے کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ غار صرف اس لئے بنوائے گئے تھے کہ وہاں لوگ تنہائی میں جا کر عبادت کر سکیں۔ مہاتما بدھ کو جہاں گیان ہوا تھا وہاں پہاڑی کو تراش کر غار بنائے ہیں جس پر خوبصورت نقوش بنائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ دکن اور اورنگ آباد کے مقام کے نزدیک بھی اسی طرح کے غار موجود ہیں۔ ان غاروں میں راماتن اور مہابھارت کی داستانوں کی بھی منظر کشی کی گئی ہے۔

گندھارا آرٹ میں وہ مشہور مجسمے شامل ہیں جس کو اس وقت مہایان فرقے کے لوگ بنایا کرتے تھے۔گندھارا آرٹ اور مجسمہ سازی پر یونانی آرٹ کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔گندھارا آرٹ کا مرکز ٹیکسلا

تھا لیکن اس کی جڑیں پشاور، مردان، سوات، تخت بھائی، افغانستان اور وسطی ایشیا تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ٹیکسلا، پشاور، اور سیدو شریف کے عجائب گھر گندھارا آرٹ کے مجسموں اور دوسرے شاہکاروں سے مزین ہیں۔ شیخ نوید اسلم گندھارا آرٹ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> گندھارا سنسکرت کا زبان کا لفظ ہے۔جس کا مطلب ہے''خوشبو کی سرزمین' 'اور یہ صوبہ خیبر پختون خواہ کے اس سرسبز و شاداب علاقے کا پرانا نام ہے جو پشاور، مردان، چارسدہ، سوات، باجوڑ، اور کوہاٹ کے اضلاع پر مشتمل ہے۔ یہ سرزمین صدیوں سے انسانی تہذیب وتمدن، ادب اور دیگر فنون کا گھوارہ رہی ہے۔ بلکہ بعض روایات کے مطابق اسے بنی آدم کے اولین مسکن ہونے کا فخر حاصل رہا ہے۔ گندھارا آرٹ کا آغاز پہلی صدی قبل مسیح میں ہوا تھا۔ تیسری صدی عیسویں تک مجسمہ سازی کا یہ فن رو بہ ترقی رہا۔ بعد میں اس کا وہ دور تو نہ رہا تاہم چھٹی صدی عیسویں تک بھی لوگ اس کی طرف مائل رہے۔ اس دوران گندھارا آرٹ نے صرف ہندوستان میں بلکہ ساری بدھ دنیا یعنی تبت، چین، برما، سری لنکا، جاوا، جاپان، اور وسط ایشیا کی فن مجسمہ سازی کو پوری شدت سے متاثر کیا۔گندھارا ایک لازوال آرٹ کی حیثیت سے ایک اہم تہذیب کی حیثیت رکھتی ہے۔پاکستان کے شمال مغربی سرحدی علاقے کو گندھارا کا علاقہ کہا جاتا ہے۔ ٹیکسلا، راولپنڈی اور پشاور اس آرٹ کے پایہ تخت رہے۔(۱۱)

گندھارا آرٹ کا مرکز ٹیکسلا اگرچہ بہت قدیم ہے لیکن جو آثار دریافت ہوئے ہیں وہ ہخامنشی اور موریہ دور سے پرانے نہیں ہیں۔ ٹیکسلا کے کھنڈر بھیر کے مقام پر ملے ہیں ۔ بھیر ہڑپہ اور موہنجودڑوہ کی طرح عمارتوں کے کھنڈر تو نہیں ہیں البتہ سب سے نچلی تہہ میں کچھ مکانات ملے ہیں جن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ مکانات امیروں کے ہیں اور کچھ غریبوں کے۔ لیکن ایک چیز جو جو دوسری تہذیبوں میں نہیں پائی جاتی وہ ہر گھر میں موجود پچیس تیس فٹ گہرا ایک چھجا ہے جس میں گندگی پھینک دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک جال نما کمرہ بھی ملا ہے جس کی چھت ستونوں پر کھڑی تھی اور اس کے اندر بہت سی مورتیاں ملی ہیں۔ دوسری اور تیسری تہہ میں سکندر اور موریہ عہد کے آثار بھی ملے ہیں۔ چونکہ اس وقت لوہے کا ستعال

عام ہوا کرتا تھا اس وجہ سے اکثر اوزار لوہے کے بنے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ تختیاں بھی بکثرت ملی ہیں ۔سونے اور چاندی کے زیورات اور کھیتی باڑی کے آلات بھی ملے ہیں۔

ٹیکسلا کی دوسری بستی سرکپ ہے۔ اس بستی کو یونانیوں نے دوسری صدی قبل مسیح میں آباد کیا تھا۔ سرکپ کی کھدائی سے بھی مختلف قسم کے اوزار ملے ہیں۔ سرکپ میں یونانی طرز پر بنی ہوئی عمارات ہیں ۔ ایک سنگ مرمر کا ستون ملا ہے جس پر آرامی زبان میں تحریر درج ہے۔ان ستونوں کے علاوہ ٹیکسلا اور سر کپ کے مضافات میں کھدائی کے دوران سونے چاندی کے زیورات ، بڑھئی اور لوہاروں ، سناروں اور جراحوں کے آلات و اوزار ، پتھر کے اوزان، کھیتی باڑی اور باغبانی کے االات اور بہت سی چیزیں برآمد ہوئی ہیں۔ ان چیزوں کی خصوصیت یہ ہے کہ سونے چاندی کی چیزیں یونانی طرز کی ہیں، جبکہ لوہے ، پتھر اور مٹی سے بنی اشیا مقامی طرز کی بنی ہوئی ہیں۔

سرکپ سے ملحق بستہ جانڈیال کے مقام پر یونانی عہد کی ایسی یادگار عمارت ہے جس کی نظیر پورے برصغیر میں نہیں ملتی۔ یہ ایک عبادت گاہ ہے جو خالص یونانی طرز تعمیر پر بنائی گئی ہے۔ اشوک نے اپنے دور میں آٹھ مقامات پر اسٹوپ تعمیر کروائے اور ہر اسٹوپ میں گوتم بدھ کے تھوڑے تھوڑے تبرکات محفوظ کئے تھے۔ٹیکسلا کا اسٹوپا (دہرم راجیکا) ان میں سے سب سے بڑا تھا۔ اختر رضا سلیمی نے دھرامار اجیکا اور اس میں موجود اانند کی منظر کشی کچھ یوں کی ہے:

> آنند سادھو جو لال رنگ کے چادر میں لپٹا دھرمارا جیکا میں موجود مہاراجہ اشوک کے محل کے پچھواڑے واقع اسٹوپ کے گرد چکر لگا رہا تھا ۔ اس کے کاندھے سے ایک چرمی تھیلا لٹک رہا تھا۔ جس پر ''غاوسہ فردوس'' کے الفاظ درج تھے۔ وہ نہ صرف 'ہے بدھا، ہے دھرما، ہے سنگھا' کی مالا جپے جا رہا تھا بلکہ 'اوم ماتی پدم اوم' کا راگ بھی الاپ رہا تھا۔(۱۲)

اختر رضا سلیمی نے یہاں بدھ مت کے دو مشہور فرقوں کا ذکر کیا ہے جو آپس میں مناظرے کرتے اور ایک دوسرے کی تردید کیا کرتے تھے ۔ لیکن آنند سادھو میں دونوں فرقوں کی تعلیمات جمع کیے ہوئے تھے۔ لکھتے ہیں:

> اس کی ذات میں ہنایان اور مہایان دونوں فرقے جمع ہو گئے تھے۔ حالانکہ ہنایان، مہایان کو بدعتی، جب کہ مہایان، ہنایان کو قدامت پرست قرار دیتے تھے۔ لیکن وہ ان کے اختلافات کو معمولی گردانتا تھا۔اس کا کہنا تھا کہ بنیادی مقصد سچ کی تلاش ہے جہاں سے بھی ملے اور جسے بھی ملے ۔صرف یوگ اور پوجا پاٹ ہی نہیں وہ دنیا کے تمام علوم کو سچ کی تلاش کا ذریعہ سمجھتا تھا۔(۱۳)

ان اقتباسات کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ گندھارا تہذیب صرف تعمیرات کی تہذیب نہیں بلکہ اس میں آنند سادھو جیسے علماء بھی تھے جو سچائی کی تلاش میں ہر دم سرگرداں رہتے تھے۔ آنند سادھو سچائی کو ایک کُلی چیز تصور کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں سچائی کی مثال ہاتھی کی سی ہے لیکن سچائی کے متلاشی اندھے ہوتے ہیں ان کا ہاتھ ہاتھی کے جس حصے پر پڑتا ہے اس کو کُل سچ تصور کرتا ہے۔ اختر رضا سلیمی نے اس کو قول کو یوں نقل کیا ہے:

> یہ تمام علوم اپنی اصل میں ایک ہیں ان سب کا مقصد سچ کی تلاش ہے۔ اپنے اپنے سچ کی تلاش۔ سچ کی مثال ایک ہاتھی کی سی ہے جبکہ ہماری اندھوں کی سی۔ ہمارا ہاتھ اس ہاتھی کے جس حصے پر پڑجاتا ہے ہم اس کو پورا سچ سمجھ لیتے ہیں ۔ حالانکہ ہمیں اس کے صرف ایک حصے کا علم ہوتا ہے، دوسرے حصے تک ہمارا ہاتھ پہنچ ہی نہیں پاتا۔(۱۴)

اشوک اعظم کے دور میں مختلف گروہ بنے ہوئے تھے جن کے درمیان فلسفیانہ مسائل پر بحث ہوتی تھی خاص کر وقت کے بارے میں آنند تانتریوں سے اختلاف رکھتا تھا۔اختر رضا سلیمی آنند اور تانتریوں کے اختلاف کے بارے میں لکھتے ہیں:

> بہت سے معاملات میں وہ تانتریوں سے اختلاف رکھتا تھا ۔ خاص کر وقت کے حوالے سے اس کا ایک جداگانہ نظریہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وقت چیزوں پر سے نہیں گزرتا بل کہ چیزیں وقت میں سے گزرتی ہیں۔ تانتریوں سے بحث کرتے ہوئے وہ اپنے چرمی تھیلے سے پوتھی نکالتا اور اس پر ہاتھ مار کر کہتا 'وقت اس پوتھی کے اوپر سے نہیں گزر رہا جیسے ندی کی تہہ میں پڑے ہوئے پتھر پر سے پانی گزرتا ہے بل کہ

یہ پوتھی بذاتِ خود وقت میں سے گزر رہی ہے'

یعنی تمہارے خیال میں دریا ہر و ٹھہرا ہوا ہے اور اس کی تہہ میں موجود پتھر اور مٹی سفر میں ہیں' تانتری اس کا مذاق اڑاتے۔'ہاں ، چلو یوں ہی سمجھ لو ۔ وہ انتہائی سنجیدگی سے کہتا 'یہ الگ بات ہے کہ تمہارا ذہن اس کا تصور کرنے سے قاصر ہے کیوں کہ تم میں اس کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔(۱۵)

اختر رضا سلیمی نے آنند کے نظریہ وقت سمجھانے کی کوشش کی ہے ۔ کہ کس طرح آنند تانتریوں کو لکیروں کے ذریعے سمجھاتے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

وہ اپنی سوئی کی نوک پہلے باری باری دونوں لکیروں پر اور پھر پوتھی پر رکھتے ہوئے کہتا ،یہ پوتھی صرف مستقبل کی طرف نہیں ماضی کی طرف بھی اسی رفتار سے سفر کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ہمیشہ لحہ موجود میں دکھائی دیتی ہے اور وقت ہمیں ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔ اگر تم خود کو وقت میں سے گزرتا ہوا دیکھنا چاہتے ہو تو آتم تیاگ دو۔پھر اس نے ایک دن اپنے کہے ہوئے پر عمل کرتے ہوئے آتم تیاگ دیا اور اپنا سچ پا لیا۔ اس دن اس نے نہ صرف تانتریوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی بل کہ یونیورسٹی کو بھی خیر آباد کہہ دیا ۔ اب وہ ٹیکسا شلہ کی پہاڑیوں میں موجود بستیوں میں در در بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ برسات کے دنوں میں دھرما راجیکا آتا ہے کہ ان دنوں اور اسے ہر پل ان کچلے جانے کا خوف دامن گیر رہتا ہے۔ پوٹلی اب بھی اس کی بغل میں دابی ہوتی ہے ۔ لیکن ان اس میں پوتیوں کے بجائے خیرات پڑی ہوتی ہے۔(۱۶)

گندھارا تہذیب اور ٹیکسلا میں موجود یونیورسٹی دھرما راجیکا کے علمی و فلسفیانہ فضا کو اختر رضا سلیمی نے بڑے خوبصورت انداز سے کھینچا ہے جو کہ مندرجہ بالا اقتباسات میں عیاں ہے۔

گندھارا کو تاریخی او رتہذیبی حوالے سے تین ادوار میں تقسیم کیا جا تا ہے پہلا دور جس میں یونانی اثر کے ساتھ مقامی اثر بھی ہے۔ جو کہ پہلی صدی عیسوی تک جاری رہا اس دور میں یونانی فن تعمیر اور یونانی

فلسفہ بدھ مت پر اثر انداز ہوتا رہا۔

اختر رضا سلیمی کے دونوں ناولوں کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ مٹتے ہوئے اقدار کا دل دادہ تھا۔ جب معاشرے مین ابھی مشین نہیں آیا ہوا تھا تو لوگ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ سب انسان مل جل کر کام کرنے کے لیے مجبور تھے۔ جندر یعنی پن چکی مٹی ہوئی تہذیب کا استعارہ ہے۔ اس وجہ سے اختر رضا سلیمی نے اپنے دوسرے ناول کا نام جندر رکھا ہے۔ جندر جاگے ہیں خواب میں کے مقابلے میں ایک مختصر ناول ہے جو صرف ایک سو انیس صفحات پر مشتمل ہے۔ سلیمی صاحب نے اس ناول میں جو تکنیک برتی ہے وہ عام دوسروں ناولوں سے بالکل جدا ہے۔ ناول کا زمانہ صرف ایک رات ہے۔ جو کہ چار گھنٹوں پر مشتمل ہے۔ یہ ناول زرعی معاشرے کا ترجمان ناول ہے جس میں مٹتے ہوئے تہذیبوں کا نوحا ہے۔ جندر ایک علامت ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پرانے تہذیب کا سارا دارومدار جندر پر ہے۔ جب جندر معاشرہ میں موجود تھا تو سب لوگ انفرادیت کے بجائے اجتماعیت کو اختیار کرنے پر مجبور تھے اور یہ سب کچھ انسان اپنی مرضی سے نہیں کرتا تھا بلکہ مجبوراً ان کو دوسرے کے ساتھ مل کر یہ کام کرنے پڑتے تھے کیونکہ اسی تہذیب میں کوئی بندہ اکیلا رہ کر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ول ڈیورانٹ اپنی کتاب انسانی تہذیب کا ارتقاء میں لکھتے ہیں:

> انسان شوق سے سیاسی جانور نہیں ہے۔ انسانی نر اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنی خواہش سے نہیں بلکہ عادت، تقلید اور حالات کی مجبوری کی وجہ سے جڑتا ہے۔ وہ معاشرے سے اس قدر پیار نہیں کرتا جتنا وہ اپنے تنہائی سے ڈرتا ہے۔ وہ لوگوں کے ساتھ اس لیے ملتا ہے کہ تفرید اسے خطرے میں ڈال دیتی ہے اور بہت سے ایسے کام ہیں جو تنہائی کے بہ نسبت مل کر اچھے طریقے سے کیے جا سکتے ہیں۔(۱۷)

یہی وہ مجبوری جس نے انسان کو مجبور کیا ہے کہ وہ تنہا کچھ نہیں ہے۔ انسان مسلسل خود مختاری اور کود انحصاری کی طرف گامزن ہے۔ کئی مشین دور نے فرد کو فرد سے جدا کیا۔ جس معاشرے میں لوگ انفرادیت کے شکار ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرد اپنے ضروریات فرد سے نہیں بلکہ مشین سے پوری کرتا ہے۔ اس وجہ سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ دنیا کے وہ ممالک جہاں صنعتی انقلابات آئے ہیں اس کا فائدہ تو یہ ہوا ہے کہ لوگوں کو بڑے پیمانے پر نوکریاں مل گئی اور ان کی معاشی حالت بہتر ہوئی لیکن نقصان یہ ہوا کہ فرد کا فرد کے

ساتھ فاصلہ بڑھتا چلا گیا اور انسان بھیانک تنہائی کا شکار ہوا۔ دن میں بارہ گھنٹے مشین پر کام کرنے والا انسان سماج سے دور ہوتا گیا۔ جس کی وجہ اس کے سماجی رابطے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئے۔ اگر چہ انسان کی فطرت میں تنہائی پسندی بھی شامل ہے لیکن جب یہ تنہائی حد سے زیادہ بڑھتی ہے تو انسان اور معاشرہ مختلف پیچیدگیوں کا شکار ہوتا ہے۔ ول یوارانٹ انسان کے تنہا پسندی کے حوالے سے لکھتا ہے؛

اپنے اندرون میں وہ ایک کہنا انسان ہے جسے دنیا کے ساتھ بھڑا دیا گیا ہے۔ اگر اوسط انسان کے پاس اپنا کوئی راستہ ہوتا تو شاید ہی کوئی ریاست ہوتی۔ وہ آج بھی اس کے خلاف ناراضگی کا اظہار کرتا ہے اور اس حکومت کا متمنی ہے جو کم سے کم حکمرانی کرتی ہو۔ اگر وہ زیادہ سے زیادہ قوانین کا مطالبہ کرتا ہے ۔اس کے لیے اسے یقین ہے کہ اس کے ہمسایوں کو اس کی ضرورت ہے ذاتی طور پر وہ ایک غیر فلسفیانہ مزاجی ہے اور اپنے معاملے میں قوانین کو فضول سمجھتا ہے۔(۱۸)

اختر رضا سلیمی بھی اسی تہذیب کا دلدادہ ہے۔ جس میں لوگ سادہ زندگی گزارتے ہیں اور اساطیری کہانیوں پر یقین رکھتے تھے۔ ناول جندر میں اختر رضا سلیمی نے ان اساطیری کہانیوں کو پیش کیا ہے کہ جدید دنیا اور سائنس تو اس سے انکاری میں لیکن گاؤں کے لوگ اب بھی ان کہانیوں میں دل چسپی لیتے ہیں اور غور سے اس کو سنتے ہیں۔ جندر ناول میں بابا جمال الدین وہ کردار ہے۔ جو شاید قدیم تہذیب کا ترجمان ہے اور اس کے عادات و اطوار سے قدامت کی جھلک نمایاں ہے مشین آنے سے پہلے گاؤں کے لوگ کہانی کلچر سے زیادہ وابستہ تھے۔ خاص کر بچے اپنے بزرگوں کے اردگرد رات کو اکھٹے ہوتے تھے۔ اور بزرگ دادا یا دادی ان کو کہانیاں سناتے جو بچے بڑے حیرت اور توجہ سے سنتے تھے ور درمیان میں سوال بھی کر لیتے۔ جندر ناول میں بابا جمال الدین ہی کچھ اسی طرح کا کردار ہے۔ جس کو سینکڑوں کہانیاں یاد ہے اور کہانیوں میں اتنا ماہر ہے کہ خود سے کہانیاں بنا بھی سکتا ہے اور پہلے سے موجود کہانی مین اضافہ بھی کرتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ کہانی کو دل چسپ اور تجسس پیدا کرنے میں بابا جمال الدین کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

بابا جمال الدین کے بارے میں اختر رضا سلیمی جندر میں لکھتے ہیں:

وہ عمر میں مجھ سے ستر سال بڑا تھا لیکن ہمارے درمیان تعلق ہم عمروں اور ہم جولیوں جیسا تھا۔ جب میں بچہ تھا اور وہ میرے باپ سے ملنے جندر پر آیا کرتا تھا تو وہ مجھ

سے بچوں ہی طرح توتلی زبان میں بات کیا کرتا تھا اور وہ میرے ساتھ بچوں کی طرح ہی کھیلتا تھا۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود وہ بہت اچھا داستان گو تھا۔ اور جہاں بیٹھتا تھا لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے او اس سے کہانیاں سنتے۔ اسے بلا مبالغہ سینکڑوں کہانیاں یاد تھی۔ وہ موقع محل کی مناسبت سے لوک داستانوں اور کہانیوں میں ردوبدل کرکے انہیں اور بھی دل چسپ بنا دیا کرتا تھا۔ اس بات کا پتہ مجھے بہت عرصے بعد، اس وقت چلا جب میں نے لوک کہانیوں کے مختلف کتابیں پڑھیں۔ بیشتر کہانیوں کے نہ صرف کردار مختلف تھے بلکہ مقامات اور ماحول بھی مختلف تھا۔"(۱۹)

بابا جمال الدین کو یہ مہارت حاصل تھی کہ ایک دفعہ سنائی ہوئی کہانی کو جب وہ دوبارہ سناتا تو اس میں ایسے تبدیلیاں سناتے وقت کر لیتے کہ سامعین سمجھتے کہ یہ کہانی ہم نہ پہلی مرتبہ سن رہے ہیں۔ بابا جمال الدین سامعین کے ذہنی سطح کو دیکھ کر کہانی سناتے تھے اختر رضا سلیمی لکھتے ہیں:

میرے بچپن کے دنوں میں وہ جب بھی ہمارے جندر پر آتا میں اس میں سے ایک آدھ کہانی ضرور سنتا۔ اگر کہانی عام بھی ہوتی تو اس کے سنانے کا انداز اسے خاص بنا دیتا تھا۔ کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ اس نے پہلے سنائی ہوئی کہانی دوبارہ سنائی لیکن مجھے اس کے انجام سے پہلے جو عموما روایتی ہوتا تھا۔ پتہ ہی نہ چلا کہ یہ وہی کہانی جو میں پہلے بھی اس کے بانی سن چکا ہوں۔ کہانی سناتے وقت وہ اپنے سامع کی سوجھ بوجھ اور ذہن سطح کو ضرور ملحوظ خاطر رکھتا تھا۔ اور اگر سامع ایک سے زائد ہوں اور مختلف زہن سطح کے ہوں تو وہ ایسی کہانی کا انتخاب کرتا تھا، جس میں ہر سامع کی دلچسپی کا کوئی نہ کوئی عنصر موجود ہو، یا پھر وہ سب کے لیے یکساں طور پر قابل سماعت ہو۔(۲۰)

بابا جمال الدین ایک ماہر نفسیات بھی تھا کہانی سناتے وقت اپنے سامعین کے چہروں کو بھی پڑھ لیتا اور ان کو پتا چلتا کہ کون کون توجہ سے سن رہا ہے اور کون اکتاہٹ کا شکار ہے۔

کہانی سناتے وقت وہ اپنے تمام سامعین پر نظر رکھتا تھا اور ان کے چہروں کے

> تاثرات ہی سے اندازہ کر لیتا تھا کہ کون دل چسپی سے سن رہا ہے اور کون اکتاہٹ کا شکار ہو رہا ہے۔ پھر اکتاہٹ کا شکار ہونے والے سامع کے ذوق و مزاج کے مطابق کہانی میں کوئی اضافہ واقعہ فٹ کر دیا تھا کرتا تھا اور یہ کام وہ اتنی مہارت سے کرتا کہ کسی کانوں کان خبر ہی نہ ہوتی۔"(۲۱)

اختر رضا سلمی جندر ناول اردو کے دو شاہکار تاریخی وتہذیبی ناولوں آگ کا دریا اور اداس نسلیں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ کہ بابا جمال الدین کو اداس نسلیں ناول پسند تھا جو کہ اسے اپنا اپنا لگتا تھا۔ لکھتے ہیں۔

> جب ناول میرے زیر مطالعہ آنے لگے تو اس میں ایک نئی زندگی عود کر آئی۔ طویل کہانی سننے میں اسے بہت مزہ آتا تھا۔ اگر ناول کی ضخامت دو سو صفحات کے لگ بھگ ہوتی تو وہ اسے ایک ہی نشست میں ختم کرنے پر اصرار کرتا۔ چوں کہ یہ نشست بسا اوقات بارہ چودہ گھنٹوں سے بھی زائد وقت کو محیط ہوتی اس لیے وہ اس روز رات کو بھی میرے ساتھ جندر پر ہی قیام کرتا اور اس کے بارے میں مجھ سے تبادلہ خیال کرتا رہتا۔ زیادہ تر ناول اس نے ایک سے زائدہ مرتبہ سنے۔(۲۲)

اب بابا جمال الدین کے زبانی مصنف اردو کے دو بڑوں ناولوں کے درمیان موازنہ کرتا ہے۔ جس میں مصنف عبداللہ حسین کے مشہور ناول اداس نسلیں کو فوقیت دیتا ہے۔ وجہ یہ بتلاتا ہے کہ آگ کا دریا کے پلاٹ میں ربط اور اجڑت ہے۔ جب کہ آگ کا دریا میں کہانی جگہ جگہ سے ٹوٹتی ہے اور اس میں ہر دم نئے کردار آتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

> اردو ناولوں میں بابا جمال الدین کا پسندیدہ ناول اداس نسلیں تھا۔ اور وہ اسے آگ کے دریا پر ہمیشہ ترجیح دیتا تھا مجھے اور حاجرہ دونوں کو اس سے اختلاف تھا اور ہم دونوں کے نزدیک آگ کا دریا اردو کا سب سے بڑا ناول تھا لیکن بابا جمال دین اس باب میں ہم سے واضح اختلاف رکھتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ اداس نسلیں میں کہانی زیادہ مربوط ہے اور مجھے اپنی اپنی سے لگتی ہے جب کہ آگ کا دریا جس کہانی جگہ جگہ سے ٹوٹی ہے اور کردار بدل جاتے ہین جس سے مجھے الجھن ہوتی

ہے۔ کہانی ہو یا ناول اس کے نزدیک اس میں دل چسپی کا عنصر ہونا ضروری تھا۔(۲۳)

اختر رضا سلیمی کے دونوں ناول ایک ایسے دیہاتی زندگی کے عکاس ہیں کہ جس میں لوگ مل جل کر کان کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے مشکلات حل کرتے ہیں۔ ناول بزرگ علی احمد جب فوت ہو جاتے ہیں تو بارش کی وجہ سے ان کی لاش ابھی تک پڑی ہوتی زوردار بارش کی وجہ سے گاؤں کے لوگوں کو اتنا موقع نہیں ملتا کہ وہ علی احمد کے لاش کو دفنا سکے۔ گاؤں کے سارے مرد وعورت لاش کے اردگرد بیٹھے ہیں اور اس فکر میں ہے کہ بارش روک جائے تو وہ لاش کو دفنا دے لیکن بارش روکنے کا نام نہیں لے رہا۔ اختر رضا سلیمی نے اس منظر کی عکاسی یوں کی ہے۔

> عشا کے وقت انہوں نے میت کمرے سے باہر رکھ دی تا کہ جس کی وجہ سے لاش خراب نہ ہو۔ لوگ آہستہ آہستہ اٹھ کر اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے۔ رات کا دوسرا پہر شروع ہونے تک بیشتر لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ بارش بدستور جاری رہی۔ اکثر لوگ خاص کر علی احمد کے قریبی عزیز گزشتہ رات سے مسلسل جاگ رہے تھے۔ نصف رات کے قریب تمام لوگ سو گئے صرف فقیر محمد ارو خان محمد جاگ رہے تھے۔ جو باہر رکھی میت کی رکھوالی کر رہے تھے تا کہ کوئی جنگلی جانور اس کے پاس نہ پھٹکنے پائے۔(۲۴)

اس اقتباس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ گاؤں کے لوگ ایک دوسرے کے تکالیف میں کس طرح بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اور پھر جب زیادہ بارش کی وجہ سے گاؤں میں نور خان کا مکان گرتا ہے تو گاؤں والوں کا کیا ردعمل ہے۔ اختر رضا سلیمی لکھتے ہیں:

> رات کے پچھلے پہر بھاری لکڑیوں کے ٹوٹنے کی آواز پوری بستی میں گونجی اور ساتھ ہی دھڑم کا زوردار دھماکا ہوا، اور ایک ساتھ تمام لوگ مارے خوف کے اُٹھ بیٹھے اور کلمے کا ورد کرتے ہوئے دھماکے کی سمت کا تعین کرنے لگے۔ بستی کے عین وسط میں نور خان کا مکان جو اس بستی کا سب سے پہلے مکان تھا اور جس کی تعمیر میں علی احمد نے بھی بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ زمین بوس ہو چکا تھا علی احمد مرحوم کا گھر اگر چہ کچھ فاصلے

> پر تھا۔ لیکن اس کے گرنے کا اندازہ سب سے پہلے فقیر محمد ہی کو ہوا، جو دھماکے سے پہلے میت کے پاس بیٹھا اور اونگھ رہا تھا۔ دھماکے کی آواز سنتے ہی، فقیر محمد اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ خان محمد اس کے پیچھے پیچھے تھا۔''(۲۵)

پرانے زمانے میں چونکہ لاوڈ سپیکر نہیں تھا اس وجہ سے جب گاؤں والوں کو کوئی اہم اطلاع اعلان یا حادثے کی خبر دی جاتی تو عموماً اونچی جگہ سے گاؤں کا کوئی آدمی بلند آواز سے اعلان کرتا جس کو سن کر سارے گاؤں کے لوگ جمع ہو جاتے۔ جب نور خان کا مکان گر گیا تو علی احمد کے ٹوٹی ہوئی مکان کے چھت پر چڑھ کر گاؤں والوں کو یہ خبر دیا کہ بابا نور خان کا مکان گر گیا ہے۔''جلدی آؤ'' ۔ بابے کے مکان کی طرف آؤ۔ بابا نور خان کا مکان گر گیا ہے۔ خان محمد گرے ہوئے مکان گرے ہوئے مکان پر کھڑے ہو کر چلایا۔''(۲۶)

جب خان محمد کی آواز گاؤں والوں نے سنی تو لوگ کس طرح پہنچ گئے۔ اختر رضا سلیمی نے اس کی منظرکشی یوں کی ہے۔

> خان محمد کا آواز ٹیلوں اور عقبی پہاڑ کی چٹانوں سے ٹکرا کر بستی میں گونجا تو ہاتھ کو ہاتھ نہ دکھائی دینے والے اندھیرے اور نہ تھمنے والی بارش میں بھی ہر آدمی کے قدم تیزی سے نور خان کے مکان کی طرف اٹھنے لگے وہ گرتے، اٹھتے، سنبھلتے کچھ ہی دیر میں وہاں پہنچ گئے۔(۲۷)

کچھ ہی دیر میں جب مالک کان اور نور خان اور اس کا دوست عبداللہ خان وہاں پہنچتے ہیں تو اندھرے میں سارے لوگ پریشان کھڑے تھے، عورتیں بھی پہنچ گئیں ہیں اور انہوں نے رونا چلانا شروع کیا تھا۔ اس دوران عبداللہ خان سب لوگوں پر غصہ کر جاتے ہیں کہ جاؤ اور اپنے اپنے گھروں سے لالٹین، گیننیاں اور بیلچے اٹھا کر لاؤ۔ جس پر سب لوگ گھروں کی طرف واپس پلٹتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے اس منظر تو کچھ یوں فکشنا ئز کیا ہے۔

> سب لوگ اپنے گھروں کی طرف بھاگے تھوڑی ہی دیر میں روشنیاں ہی روشنیاں مکانوں کے دروازوں سے نکل کر بستی کے کھیتوں، اونچے اونچے ٹیلوں اور گلیوں میں

> بھاگنے لگیں۔ تمام روشنیوں کا رخ بستی کے مرکز کی طرف تھا۔ اگر فضا سے کوئی اس منظر کا نظارا کرتا تو اسے محسوس ہوتا، جیسے کسی کہکشاں کو کوئی بلیک ہول نگل رہا ہے اور اس کے تمام ستارے، جو اس کے مرکز کی طرف بھاگ رہے ہین۔ اگلے چند ہی لمحوں میں ایک جگہ ڈھیر ہو کر اندھیرے کا حصہ بن جائیں گے۔ تھوڑی ی دیر میں تمام روشنیاں، اندھیرے میں ڈوبی ہوئی بستی کے عین وسط میں جمع ہوگئیں اور ٹھک ٹھک کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوگئیں۔ ان آوازوں کی کوئی خاص ترتیب نہیں تھی نہ ہی اس میں تھکن کے کوئی آثار تھے۔ چیخنے چلانے اور دوسری انسانی آوزاوں کا شور و غل بھی انہیں ان آوازوں سے ممیز کر رہا تھا۔(۲۸)

اختر رضا سلیمی گاؤں کے لوگوں کے مل جل کر کام کرنے کو کچھ اس انداز سے پیش کرتے ہیں جیسے یہ خود اسی پرانے تہذیب کا حصہ رہے ہوں۔ خاص کر درختوں اور پتھروں سے نکلی ہوئی خاص آوازوں کو بھی وہ لفظوں کے ذریعے واضح کرتے ہیں۔ جب گاؤں کے لوگ اس میں کام کرتے ہیں۔ تاہم ہم یہاں یہ بات واضح کرتے ہیں کہ جندر کی تہذیب میں کس طرح لوگ ایک دوسرے کی مدد کررہے ہیں اور گاؤں کے بڑے بڑے کام جلد نمٹاتے تھے۔ بارش کے باوجود جب گاؤں میں نور خان کے مکان علاوہ دوسرے مکانات بھی گرنا شروع ہو جاتے ہیں تو لاشوں کے تعداد بڑھنے لگتیں ہیں جس کی وجہ سے گاؤں کے لوگوں نے میتوں کو تیز بارش کے باوجود دفنانے کا فیصلہ کیا۔

اختر رضا سلیمی لکھتے ہیں:

> سب نے گینتیاں، کدالیں، بیلچے اور پھاوڑے اٹھا لیے اور مکانوں کے پیچھے ایک بڑے کھیت کے مغربی سرے پر واقع علی احمد کی قبر کی طرف چل پڑے۔ قبر کے اردگرد تالاب سا بن چکا تھا۔ سب سے پہلے پانی کی نکاسی کا انتظام کیا گیا۔ پھر مرلہ بھر جگہ کے چاروں طرف نالیں کھودی گئیں۔ تا کہ اس قطعے کے اندر پانی داخل نہ ہو سکے۔ گرے ہوتے مکان کے شہیتر اٹھا کر لاتے گئے۔ جنہیں منتخب جگہ کے چاروں کونوں میں عمودی طور پر نصب کیا گیا اور ان کے اوپر موٹے تر پال ڈال کر تین قبروں کی کھودائی شروع کر دی گئی۔(۲۹)

اختر رضا سلیمی کے دونوں ناولوں ناسٹلجیاتی کیفیت ہے وہ ماضی کو بڑے حسرت سے یاد کرتے ہیں۔ خاص کر جندر ناول میں یہ رجحان نمایاں ہے۔ جندر ناول میں وہ سارے مناظر موجود ہیں جس کو دیکھ کر قاری کو ایک خوشگوار احساس ہوتا ہے۔ قدیم تہذیب کا ترجمان کردار بابا جمال دین کہتے ہیں۔

> بابا جمال الدین بتایا کرتا تھا کہ وہ یہاں سے ہر ہفتے انگریز افسروں کو گزرتے ہوئے دیکھا کرتا تھا جو کبھی، کبھار ستانے کے لیے یہاں جندر کے پچھواڑے موجود کا ہو کے صدیوں پرانے درخت کے نیچے رکا بھی کرتے تھے ان کے ساتھ مقامی سپاہی بھی ہوتے تھے۔ جو گھوڑوں کے پیچھے پیچھے چل رہے ہوتے تھے۔(۳۰)

اختر رضا سلیمی ان قافلوں کے بارے میں لکھتے ہیں جو قافلے جنگل میں واقع گیارہ فٹ راستے پر روزانہ جاتے۔ لکھتے ہیں۔

> میرے ہوش سنبھالنے تک گھوڑوں پر سوار گندمی رنگت کے افسر اور پیادہ سپاہی دونوں غائب ہو چکے تھے البتہ بغیر پرمٹ کے درخت کاٹنے والے بدستور یہاں سے گزرتے تھے؟ لکڑی لدے خچروں، اور اونٹوں کے ساتھ سورج غروب ہونے کے بعد جیسے ہی دھند لکا پھیلتا ان کے قافلے مشرق میں واقع قصے کی طرف سے طلوع ہونا شروع ہو جاتے اور سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے یوں غائب ہو جاتے، جیسے انہیں روشنی نگل گئی ہو۔(۳۱)

اختر رضا سلیمی نے ایک خوبصورت اصطلاح استعمال کی ہے۔ یعنی اماوس سے مراد وہ رات ہوتی ہے جس میں چاند کی روشنی نہ ہو۔ قمری مہینے کی آخری رات جو بہت تاریک ہوتی ہے۔ اماوس کی رات میں کیا ہوتا تھا۔ اختر رضا سلیمی لکھتے ہیں؛

> بابا جمال الدین نے ، جو اندھیرے سے خاصا مانوس تھا اور انہیں اماوس کے راتوں میں بھی دیکھ لیا کرتا تھا۔ مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے اپنے خچروں کے نعلوں پر بھی چمڑا چڑھا رکھا ہوتا تھا تا کہ چلتے ہوئے ان کے قدموں کی آہٹ نہ سنائی دے سکے۔ البتہ وہ لوگ جو باقاعدہ سرکاری پرمٹ لے کر درخت کاٹتے تھے، دن کے

> وقت بھی یہاں سے گزرتے رہتے تھے تاہم گرمیوں کے دنوں میں یہ بھی عموماً راتوں ہی کو یہاں سے گزرتے تھے۔ یہ تعداد میں بہت کم تھے۔ تاہم ان کی نشانی یہ تھی کہ ان کے اونٹوں اور خچروں کے گلوں میں گھنٹوں کے کینٹھے بندھے ہوتے تھے، اور جب ان کا قافلہ یہاں سے دو میل کے فاصلے پر ہوتا، سامنے والے ٹیلے کی چوٹی پر بیٹھے ہوتے شخص کو ان کی ٹن ٹن سنائی دین لگتی تھی۔'' (۳۲)

ناول میں اختر رضا کی ناسٹلجیاتی کیفیت اپنی عروج پر ہے۔ کہتے ہیں کہ جب میں جوان تھا تو مجھے یہاں سے گزرنے والے اونٹوں کے گلوں میں پڑے ہوتے گھنٹوں کی ٹن ٹن کی آواز بہت بہت خوبصورت لگتی تھی۔ اختر رضا سلیمی اس خوبصورت منظر کو کچھ یوں پیش کرتے ہیں۔

> اپنی جوانوں کے دنوں تک تو میں بھی انہیں یہاں سے گزرتے دیکھتا رہا تھا۔ مجھے اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹوں کی ٹن ٹن بہت بھلی لگتی تھی۔ میں ٹن ٹن کی آوازوں سے زیادہ لطف اندوز ہونے کے لیے جندر کے کھارے میں بڑی چونگ انڈیلتا، جندر کا دروازہ بھیڑتا اور ندی عبور کرکے سامنے والے ٹیلے، پر موجود سب سے اونچی چٹان پر جا کھڑا ہوتا اوراپنے کان جنگل کی طرف سے آنے والے رستے پر لگا دیتا، جہاں سے اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹوں کی آواز دور سے باآسانی سنائی دیتی تھی۔ (۳۳)

آگے کا منظر بھی بہت خوبصورت ہے جب گھنٹوں کی آوازیں، جنگل کے درمیان بہنے والی ندی اور جندر کے آوازیں مل کر بندے کو ایک عجیب سرور بخشتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''جوں ہی اونٹوں کے گلے میں ٹن ٹن کرتی گھنٹوں کی ہلکی ہلکی آوازیں میرے کانوں کے پردوں کو چھوتیں میں سمجھ جاتا کہ قافلہ جنگل سے نکل کر اس موڑ پر آپہنچا ہے، جہاں سے جنگل کے بیچوں بیچ بہنے والی چھوٹی ندی، اس بڑی ندی میں آکر ملتی ہے۔ ٹیلے پر موجود نہ چٹان ایک ایسا مقام تھا جہاں سے جندر کی گونج اور اونٹوں کے گلے میں ٹن ٹن کرتی گھنٹوں کی مدھم آواز کی بیچ ایک جیسی معلوم پڑتی تھی۔ جوں ہی یہ قافلہ اس مقام پر پہنچتا جہاں کسی دور میں اس علاقے کے راجا کا جندر ہوا کرتا تھا،

مجھے اپنے جندر کی گونج اور ندی کے بہتی پانی کا شور، ان اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی ٹن ٹن میں دبتا ہوا محسوس ہوتا اور میں بھی اسی تناسب سے اپنے قدم آہستہ آہستہ اترائی کی طرف بڑھانا شروع کر دیتا۔ تاکہ ان دونوں طرح کی آوازوں کے درمیان وہ توازن برقرار رکھ سکوں۔ جو میری سرشاری کو دو آتشہ کر دیتا تھا۔ جب قافلہ جندر سے صرف دو سو قدم کے فاصلے پر ہوتا، میرے قدم ندی کے پانیوں کو چھو رہے ہوتے۔ میں کچھ دیر ندی کے درمیان موجود ایک چٹان پر کھڑے ہو کر جندر کی گونج اور گھنٹوں کی ٹن ٹن سے لطف اندوز ہوتا، پھر جو ہی یہ قافلہ جندر کے پچھواڑے پہنچتا اور ٹن ٹن کے تیز شور میں ندی کی گونج کا دم گھٹنا شروع ہوتا، میں بھاگ کر جندر کے صحن میں داخل ہو جاتا۔ جہاں جندر کی گونج، ٹن ٹن کے شور سے مل کر ایسا سماں تشکیل دیتی کہ میرا دھمال ڈالنے کو جی چاہتا۔ پھر جوں جوں قافلہ آگے قصبے کی طرف بڑھتا ٹن ٹن کی آواز بدستور کم ہونا شروع ہو جاتیں یہاں تک کہ اس مقام پر، جہاں مغرب سے مشرق کی طرف بہنے والی، اس ندی کا رخ اچانک شمال کی طرف مڑ جاتا ہے۔ یہ آوازیں بالکل معدوم ہو جاتیں اور میں جندر کے کھارے میں نئ چونگ انڈیل کر اس کے صحن میں موجود تھلے پر لیٹ کر سونے کی تیاریاں کرنے لگتا۔ (۳۴)

اختر رضا سلیمی اپنے ناول جندر میں ماضی کو خوبصورت گردانتے ہیں کہتے ہیں کہ گاؤں میں بہنے والی بڑی ندی پر جتنے پن چکی بنی تھی ہر پن چکی پر چونگوں کا رش ہوتا اور سب کا کام ہو جاتا۔ گاؤں میں رہنے والے اکثر لوگوں کا انحصار کھیتوں پر ہوتا سب لوگ سال میں دو مرتبہ بوائی کر لیتے۔ کیوں کہ جو لوگ اپنی زمین کی بوائی نہ کر لیتے تو گاؤں والے ان کو طعنے دیتے۔ لکھتے ہیں:

مگر یہ سب بھلے وقتوں کی یادیں ہیں؟ ان دنوں کی جب صرف میرے ہی نہیں اس ندی میں موجود ہر جندر پر چونگوں کا اتنا رش ہوتا تھا کہ سب کے سب آٹھوں پہر گھومتے رہتے تھے ان دنوں گاؤں والوں میں سے اکثر کی گزر اوقات کا واحد ذریعہ کھیتی باڑی ہوتا تھا اور کسی سال کوئی شخص کسی وجہ سے بوائی نہ کر سکتا تو اسے زمین سے بے وفائی کا طعنہ دیا جاتا یہی وجہ ہے کہ ان دنوں وہ لوگ بھی جن کا ذریعہ

> معاش کچھ اور ہوتا۔ سال میں دو مرتبہ اپنی زمین پر ہل ضرور چلاتے تھے تاکہ زمین سے بے وفائی کے مرتکب نہ ہوں۔ خود میرا باپ بھی، جس کی گاؤں میں زرعی زمین نہ ہونے کی برابر تھی اور اس کے معاش کا تمام تر انحصار اس جندر کے گھومتے پاٹوں پر تھا، سال میں دو مرتبہ ضرور زمین بیچتا تھا۔ حالاں کہ رکھوالی نہ کرنے کی وجہ سے اول تو زمین میں بیجا گیا دانہ پرندے چگ جاتے تھے اور اگر زمین میں سے کچھ پھوٹ بھی نکلتا، تو اسے اڑوس پڑوس کے مال مویشی تباہ کر کے دکھ دیتے تھے۔(۳۵)

اختر رضا سلیمی نے اس شاندار رسم کو ناول میں یاد کیا ہے جب گاؤں میں کٹائی یا گاہی ہوتی تو سارے گاؤں والے مسجد میں اکٹھے ہو جاتے۔ وہاں مولوی صاحب ان کے فصلوں میں برکت کے لیے دعا کرتے اور پھر وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ گاہی کے موسم میں گاہی کرتے اور کٹاتی کے موسم میں پورے گاؤں کے فصل کو مشترکہ طور پر کاٹتے تھے اور پھر سارے گاؤں کے فصل کو کسی سایہ دار میدان میں جمع کر لیتے۔ جہاں پورے گاؤں کے بیل گندم کے فصل کے اوپر گول دائرے میں چلتے جس سے دانے الگ اور بھوسہ الگ ہوتا۔ اختر رضا سلیمی نے اس اجتماعی رسم کے لیے ''لیتری'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ پشتو میں اس رسم کو غوبل کہا جاتا ہے جو تھریشر کے آنے کے بعد معدوم ہو گیا ہے۔

اختر رضا سلیمی کے دوسرے ناول جندر میں ایک چیز خاص طور پر نمایاں نظر آتا ہے اور وہ قدیم و جدید تہذیبوں کے درمیان آمیزش ہے۔ قدیم تہذیب کا خاصا یہ ہے کہ اس میں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے، ایک دوسرے کے کاموں میں حصہ لیتے تھے۔ غمی شادی کے موقع پر سارے گاؤں کے لوگ ایک دوسرے کی مدد کے لیے ہر دم تیار رہتے۔ اس وجہ سے گندم کی کٹائی یا پھر گاہی کے دنوں میں گاؤں کے وہ لوگ جو دور شہروں میں ملازمت یا محنت مزدوری کرتے تھے وہ بھی لیتری میں حصہ لینے کے لیے بروقت پہنچ جاتے، گاؤں میں کسی فرد میں یہ ہمت نہ تھی کہ وہ اجتماعی کاموں سے خود کو الگ کرے۔ کوئی بھی ایسا بندہ جو گاؤں کے اجتماعی کاموں میں حصہ نہ لیتا۔ تو سارے گاؤں والے ان سے اجتماعی طور پر بائیکاٹ کرتے اور ان غم و شادی میں لوگ نہ جاتے۔ اسی طرح کے بندے کو لوگ طعنے دیتے اور ان کو ہم ہمت، کاہل اور بے غیرت تصور کرتے۔ اختر رضا سلیمی لکھتے ہیں؛

> فصلوں، خاص کر گندم کی کٹائی اور گاہی کے دنوں میں وہ لوگ بھی جو شہر میں نوکری یا

کاروبار کر رہے ہوتے، راتوں رات گاؤں آ جاتے اور صبح سویرے درانتیاں اٹھائے لیتریوں میں شمولیت کے لیے کھڑے ہوتے۔ سب مل جل کر ایک دوسرے کے فصل کاٹتے، انہیں ڈھو کر مکانوں کے ۔۔۔ اور کھلیانوں میں جمع کرتے اور پھر میلوں کی جوڑیوں کے پیچھے کاہو کی خشک پھننگیں باندھ کر اسے گاہتے۔ مکئی کی کٹائی کے بعد گاؤں کی عورتیں مل کر اسے چھیلتیں اور پھر مرد راتوں کو بھاری سوئے لے کر اسے کوٹے اور ان کے دانے علاوہ کرتے۔ شاید یہ مجبوریاں تھیں جو لوگوں کو ایک دوسرے سے بڑے رہنے اور محبت کرنے پر اکساتیں تھیں۔(۳۶)

ناول کا مرکزی کردار ولی خان ہے جو کہ خود اپنی کہانی بیان کرتا ہے۔ یہ ناول واحد متکلم کے صیغے میں ہے۔ گاؤں کے سخت روایات اور ان پابندی سخت ضروری تھی۔ لکھتے ہیں۔

لیتری لپھوچھی اور اس طرح کی دوسری رضا کا تنظیموں نے لوگوں کو ایک دوسرے سے باندھ رکھا تھا اور ان کے بغیر گاؤں میں کسی بڑے کام کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لوگ جنازے کا تو فرض کفایہ سمجھ کر چھوڑ دیتے تھے لیکن ان چیزوں پر فرض عین کی طرح عمل کرتے تھے۔ یہاں تک کہ گاؤں کے مولوی صاحب ان لوگوں کو تو معاف کر دیتے تھے جو صرف نماز عید پڑھنے سال کے بعد مسجد کا رخ کرتے لیکن لیتری سے غیر حاضر ہونے والے کو یوں دیکھتے تھے جیسے وہ کافر ہوں۔(۳۷)

ناول کا مرکزی کردار ولی خان اپنے ماموں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے گاؤں کے ان روایات سے بغاوت کیا۔ وہ ہمارے گاؤں کا پہلا میٹرک پاس تھا۔ وہ شہر میں ملازمین کرتا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ لیتری کے رسم سے علیحدگی اختیار کی حتیٰ کہ پھر ایسا وقت بھی آیا کہ وہ لیتری کے موقع پر مکمل غیر حاضر رہتا۔ لکھتے ہیں:

میرا ماموں جو اپنے والدین کی اکلوتی نرینہ اولاد، اور گاؤں کا پہلا میٹرک پاس تھا، واحد آدمی تھا، جس نے اس رسموں سے خاموش بغاوت کی تھی، وہ اپنی تعلیم مکمل ہونے کے بعد شہر چلا گیا تھا اور وہاں سے ایک سرکاری ادارے میں اچھی نوکری مل گئی تھی ۔ شروع شروع میں تو وہ بھی کٹائی کے موسموں میں گاؤں آ جاتا لیکن رفتہ

> رفتہ وہ لیری سے غیر حاضر رہنے لگا اور اپنی فصل دوسری گاؤں سے مزدور منگوا کر کٹوانے اور گاہوانے لگا۔ پھر اس نے اپنی زمین کسی ٹھیکے پر دے دی جو اس کے حصے کے دانے پر سال شہر پہنچا دیا کرتا تھا۔ جب وہ مرا اور اس کے بیٹے اس کی میت لے کر گاؤں آئے تو اس کی قبر مجھے اور اس کے دو بیٹوں کو تنہا کھودنا پڑی تھی کہ گاؤں کا کوئی بھی آدمی اس کے قبر کھودنے نہیں آیا تھا۔ تاہم جنازے میں پورا گاؤں شریک ہوا تھا کہ اس نے بھی کسی کا جنازہ نہیں چھوڑا تھا اور اگر وہ کسی وجہ سے نہیں آسکا تو اپنی بیوی یا بیٹے کو ضرور بھجوایا تھا۔(۳۸)

لیتری میں شرکت کے علاوہ گاؤں کے ماحول کچھ دیگر چیزوں کی پابندی ضروری تھی وہ یہ کسی نے مکان بنانا ہے تو گاؤں کے ہر گھر سے ایک فرد مکان بنانے میں مالک مکان کی مدد کرتا۔ جس میں لوگ مختلف کام کرتے تھے۔ لکھتے ہیں۔

> ان دنوں گھروں کی تعمیر میں بھی لوگ رضا کارانہ طور پر حصہ لیتے۔ جب کوئی شخص نیا مکان بنانے کا منصوبہ بناتا گاؤں کے بیشتر لوگ اس میں بلا معاوضہ ہاتھ بٹانے آتے تھے۔ دیواروں کی چنائی کرنے والے مستری کے علاوہ کسی کو معاوضہ دینے کا رواج نہ تھا۔ چوں کہ اس علاقے میں ہر سال سردیوں میں برف پڑتی تھی اس لیے یہاں بنائے گئے مکانوں کی چھتوں پرٹنوں کے حساب سے مٹی ڈالی جاتی تھی تاکہ چھت ٹپکنے سے محفوظ رہے۔(۳۹)

مکان بنانے کے لیے جنگل سے کڑیاں لانے کا کام بھی گاؤں کے لوگ مل جل کر کرتے اور چھت پر مٹی ڈالنے کے لیے بھی سب لوگ اکٹھے ہو جاتے، چھت پر مٹی ڈالنے کے عمل کو پہوچھی کہا جاتا ہے۔ اختر رضا سلیمی لکھتے ہیں؛

> مکان کی تعمیر کا سب سے اہم مرحلہ جنگل سے بھاری کڑیاں اور بالے اٹھا کر لانا اور پھر چھت پر مٹی ڈالنا ہوتا تھا۔ کڑیاں لانے کے لیے لوگ کی پوری ٹولی جنگل کا رخ کرتی اور بھاری کڑی کے دونوں سروں پر کاہو کے مضبوط ڈنڈے باندھ کر چار آدمی اسے اٹھاتے اور چل پڑتے جوں ہی ان میں سے کوئی آدمی تھکتا کوئی دوسرا اپنا کندھا

بڑھا دیتا اور پہلا کڑی کے نیچے سے ایک طرف سرک جاتا۔ مٹی ڈالنے کے عمل کو پھوچھی کہا جاتا تھا۔ پھوچھی میں گاؤں کے ہر گھر سے ایک آدمی ضرور شرکت کرتا۔ (۴۰)

زرعی معاشرے میں عورت مرد کے برابر کام کرتی رہتی ہے اور مرد عموماً گھر کے باہر امور سرانجام دیتے ہیں جیسے کھیتوں میں کام کرنا، فصل کی کٹائی، پہاڑ سے لکڑی لانا، جبکہ عورت مرد کے برابر مذکورہ کام بھی کرتی ہے اور ساتھ گھریلوں کام بھی کرتی ہے جیسے بچوں کی دیکھ بھال، ان کی تعلیم و تربیت، پالتو جانوروں کی دیکھ بھال ان کو چارہ اور بھوسہ ڈالنا، دودھ دوہنا، کھانا پکانا، گھر کی صفائی، اپلے تھاپنا اور مردوں کے لیے کھانا کھیتوں میں پہنچانا، اگر ہم زرعی معاشرے میں مرد اور عورت کا موازنہ کریں۔ تو ہم اس نتیجے پر پہنچے گے کہ زرعی معاشرے میں مرد کے مقابلے میں عورت زیادہ کام کرتی ہے وہ گھریلوں امور کے ساتھ بیرونی امور میں بھی مرد کے برابر کام کرتی رہتی ہے۔ ابھی پاکستان کے دیہاتی علاقوں میں عورت کا یہی کردار ہے۔ اس کے مقابلے میں شہر کی عورت کی اتنی ذمہ داریاں نہیں ہوتی ہیں۔ اختر رضا سلیمی رکھتے ہیں کہ کھیتوں میں جب مکئی کے گھٹے خشک ہو جاتے تو پھر باقی کام عورتوں کو کرنا پڑتا۔ لکھتے ہیں:

> ہفتہ بھر بعد جب مکئی مکمل طور پر سکھ جاتی تو عورتوں کی ایک ٹولی گھٹے اٹھا کر زمین پر رکھتی اور چھلیاں علیحدہ کرنے کا عمل شروع کر دیتی۔ یہ کام صرف خواتین ہی کرتیں مردوں کا کام صرف چھیلی ہوئی چھلیوں کو گھر پہنچانے تک محدود ہوتا۔ (۴۱)

مکئی کی یہ چھلیاں جب گھر پہنچائے جانے تو کچھ دنوں کے لیے دھوپ میں خشک ہو جاتے اور خشک ہونے کے بعد ایک دفعہ پھر مرد سوٹے لیکر مشترکہ طور پر گھر کے مکئی کو کوٹتے۔ گندم گاہنے کا عمل ہمیشہ دن جبکہ مکئی ہمیشہ رات کو کوٹی جاتی۔ باقی کا کام پھر سے عورتیں سنبھال لتیں اور چھاج لے کر گندم کی صفائی کا کام شروع کر دتیں۔

جب فصلوں کی کٹائی کا آغاز ہوتا تو اس سے پہلے خواتین گھروں کے صحنوں اور کھلیانوں کی گاری سے لپائی شروع کردتیں۔ پرانے زمانے بلکہ اب بھی ہمارے دیہاتوں میں کچے مکان ہوتے ہیں۔ یہ مکانات عجیب خصوصیت کے حامل ہوتے ہیں۔ گرمیوں میں ٹھنڈے جبکہ سردیوں میں گرم ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے جو پکے مکانات ہیں۔ گرمیوں میں گرم جبکہ سردیوں میں انتہائی سرد ہوتے ہیں۔ لیکن اس میں

سہولت یہ ہوتی ہے کہ خواتین کو ہر سال لپائی کرنا نہیں پڑتی۔ ایک بار گھر بنا لیا پھر ساری عمر لپائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اختر رضا سلیمی اس حوالے سے لکھتے ہیں؛

فصلوں کی کٹائی کے آغاز سے پہلے ہی گاؤں کی خواتین اپنے گھروں کے صحنوں یا کھلیانوں کی گارے سے لپائی شروع کر دتیں تا کہ گاہ گاہنے کے لیے راستہ ہموار کیا جاسکے۔(۴۲)

ایک اور اجتماعی رسم جس کو سب بیلوں سے انجام دیتے ہیں۔ وہ گاہنے کا محل کہلاتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے جس میں بھوسہ الگ اور دانے الگ ہوتے ہیں اختر رضا سلیمی لکھتے ہیں:

جوں ہی کٹائی ختم ہوتی اور گندم کے گٹھڑے سوکھ کر گاہے کے قابل ہوتے لوگ مختلف ٹولیوں میں بٹ جاتے اور بیلوں کو جوت کر اور ان کے پیچھے کاہو کی سوکھی پھنگینیں باندھ کر اور ان کے اوپر بھاری پتھر رکھ کر گاہی شروع کر دیتے۔ بچے ان پتھروں کے اوپر بیٹھ کر سواری کا مزہ لیتے اور ہاتھوں میں کاہو کی پتلی سوٹیاں لیے بیلوں کو ہنکارتے جب گندم کے گھٹے بھوسے کی شکل اختیار کر چکتے اور دانے جھڑ چکتے تو مرد ترنگلیں لے کر ہوا کا رخ بھانپنے اور بھوسا اڑاتے جس سے دانے ایک طرف جبکہ بھوسا اڑا کر دوسری طرف جا گرتا۔ اگلے ایک دو دنوں میں ، صحن میں ایک طرف دانوں کی جب کہ دوسری طرف بھوسے کی ڈھیریاں بنی ہوتیں۔(۴۳)

زرعی تہذیب میں مردوں کی مصروفیت صرف کٹائی کے دنوں میں ہوتی تھیں جبکہ خواتین سارا سال کاموں میں جتی رہتی ہیں۔ وہ گھر کے اندرونی و بیرونی امور دونوں نمٹاتی ہیں۔ اور خاندان کے کفالت میں بڑا حصہ خواتین کی محنت سے آتی ہے۔

زرعی معاشرے کا انسان اساطیر اور ماورائیت پر زیادہ یقین رکھتا تھا کیونکہ زراعت کے لیے انسان کو زیادہ تر انحصار قدرتی طاقتوں پر کرنا پڑتا اس وجہ سے جب آسمان سے بارش برستی تو آسمان ان کے لیے مہربان بادشاہ کی حیثیت اختیار کرتا۔سورج کی روشنی چوں کہ زراعت کے لیے بہت اہم اہمیت رکھتی ہے اس وجہ سے قدیم زرعی معاشرے میں سورج کی پوجا کی جاتی تھی۔ ہندوستان دنیا کا ایک ذرخیز اور بہت بڑا

زرعی ملک ہے۔ اس وجہ سے وہاں بڑے پیمانے پر اساطیری نظریات نے جنم لیا۔ ہندوستان میں گائے کو، اس لیے مقدس جانور مانا جاتا ہے کہ گائے زرعی معاشرے کی اہم اکائی ہے۔ زرعی معاشرے میں لوگ اپنے معاشی ضروریات گائے کے دودھ، دہی، مکھن، لسی اور گھی سے کرتے ہیں۔یعنی زرعی معاشرے میں پورے خاندان کی کفالت گائے سے کی جاتی ہے۔ اس وجہ سے ہندوستان میں گائے ایک مقدس جانور کی حیثیت اختیار کر گئی جس کی ذبح کرنے پر پابندی لگ گئی جو ابھی تک برقرار ہے۔ زرعی معاشرے کے برعکس صنعتی معاشرے کے لوگ اساطیر پر زیادہ یقین نہیں رکھتے۔ کیوں کہ صنعتی معاشرے کا انسان زیادہ تر مشین پر انحصار کرتا ہے۔ وہ اپنے ضروریات کے لیے قدرتی طاقتوں کے بجائے انسان کے بنائے ہوئے مشینوں پر انحصار کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد لوگ زیادہ تعقل پسند ہوگئے اور تسخیر فطرت کی طرف تیزی سے سفر شروع کیا۔ اختر رضا سلیمی کے دونوں ناول جاگے ہیں خواب میں، اور جندر چوں کہ زرعی معاشرے کے ترجمان ناول ہیں۔ اس وجہ سے اس نے اسطوراتی واقعات کا ذکر اپنے ان دو ناولوں میں کیا ہے۔ جس پر گاؤں کے رہنے والے لوگ کافی حد تک یقین رکھتے ہیں۔

ناول کا ایک بوڑھا کردار علی احمد ہے۔علی احمد جب فوت ہوتا ہے۔تو گاؤں کے سارے خواتین میت کے گھر پہنچ جاتی ہیں اور ایک دوسرے سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگتیں ہیں۔خواتین میں نور آباد کو بسانے والے نور خان کی بیوی بھی شامل ہے۔ جو کہتی ہے کہ تو پرسوں ہی سمجھ گئی تھی کہ کچھ برا ہونے والا ہے کیوں میں اذان کے ساتھ ساتھ گیدڑوں کے منحوس آوازیں سنی ہیں۔

خیبر پختون خواہ کے اکثر دیہات میں بزرگ لوگ ابھی تک اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جب گیدڑ رات کو چلانے لگتے ہیں تو بزرگ لوگ خدا سے خیر کی دعا مانگتے ہیں اور کہتے ہیں خدا خیر کریں کچھ برا ہونے والا ہے اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ جانور موت کے فرشتے کو زمین کی طرف آتے ہوئے دیکھتے ہیں اس وجہ سے چلاتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی کہتے ہیں؛

> نور خان کی بیوی نے بین کرتے ہوئے کہا بہن! میں تو پرسوں شام کو ہی سمجھ گئی تھی کہ لالہ جی اب نہیں بچیں گے جیسے ہی مغرب کی اذان بلند ہوتی تھی ۔ گیدڑوں نے منحوس آواز میں چلانا شروع کیا تھا۔ میں نے اسی وقت فقیرے کاکا سے کہا کہ یہ گیدڑیاں ہیں۔ لیکن انہوں نے الٹا غصہ کیا اور کہنے لگے کہ تو ان کی دائی لگی ہوئی

ہے۔ گیڈر بھی تو ہو سکتے ہیں۔(۴۴)

نور خان کی بیوی نے جب یہ بات کیں تو دوسری خواتین نے بھی کہنا شروع کیا:

> ہاں بہن! میں نے بھی ان کی منحوس آواز اپنے کانوں سے سنی تھی۔ دو تین خواتین نے بیک وقت کہا۔ میں نے تو کل دو بلیوں کو بھی سر جوڑ کر روتے ہوئے دیکھا۔ خدا خیر کرے۔ ابھی صبح سویرے جب میں ادھر کو آ رہی تھی میرا کتا آسمان کی طرف منہ کر کے بھونک رہا تھا۔ خدا خیر کرے کوئی اور مصیبت ناول نہ ہوایک خاتون جس کا گھر بستی سے تھوڑا ہٹ کر تھا۔ سر سے کھسکی ہوئی چادر کو درست کرتے ہوئے کہا۔ (۴۵)

خیبر پختون خواہ کے دیہاتوں میں جب فوتگی ہوتی ہے پھر جب بارش شروع ہو جاتی ہے تو لوگ مرے شخص یا خاتون کو نیک تصور کرنے لگتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے بھی ناول میں لوگوں کے اس سوچ کی ترجمانی کی ہے۔علی احمد کے موت کے بعد بارش شروع ہوتی تو لوگ بہت خوش تھے اورعلی احمد کو نیک تصور کرنے لگے لکھتے ہیں:

> علی احمد بہت نیک آدمی تھا۔شلوار کے پائینچے اڑسے، سروں پر بوریوں کے منڈا سے رکھے، ایک مکان کے پرنالے کے نیچے سے گزرتے ہوئے دو آدمیوں میں سے، ایک نے دوسرے سے کہا۔ ہاں خان محمد تبھی تو رحمت برس رہی ہے پچھلے سال تو بادل اڈنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔(۴۶)

ایک اور روایت جو ہمارے بچپن میں بھی موجود تھا لیکن اب ترک کیا گیا ہے وہ کہ جب بارش نہ ہوتی تھی تو سب لڑکے مل کر ایک لڑکے کو پکڑ کر اس کے چہرے پر کالک ملتے اور اس کو پوری بستی میں گھمایا جاتا۔دوسرے لڑکے کے ساتھ ہوتے جو ہر گھر میں جاتے اور وہاں کچھ مخصوص کلمات ادا کرتے جس پر گھر والے خوشی خوشی ان کو آٹا دیتے۔

ایک اور روایت جو کہ خیبر پختون خواہ میں ابھی ترک کیا گیا ہے لیکن سن دو ہزار سے پہلے یہ روایت موجود تھی اور پنجاب کے اکثر دیہاتوں میں اب بھی موجود ہے۔ کہ جب بارش نہ ہوتی تو گاؤں کے لوگ کسی ولی اللہ کے قبر سے جا کر دیگ کا نذرانہ پیش کرنے کی روایت کو اختر رضا سلیمی نے یوں نقل کیا ہے

جس میں ایک شخص دوسرے شخص سے مخاطب ہے۔

میں نے اپنے بیٹے کے رخساروں پر کالک مل کر اسے پوری بستی میں گھمایا تھا پہلے آدمی نے کہا۔ وہ تو خدا بھلا کرے نور خان کا جس نے بری امام جا کر ایک پوری دیگ چڑھائی تھی۔ تب جا کر تھوڑی بہت بارش ہوتی اور ہم نے بوائی کی۔ ورنہ تو ہم بھوکے مر رہے ہوتے ۔ دوسرا گویا ہوا۔(۴۷)

علی احمد کے مرنے کے بعد جو بارش شروع ہوئی وہ برابر برس رہی تھی بارش رکنے کا نام نہیں لی رہی تھی۔ عصر ہو چکی تھی لیکن بارش کے رکنے کے کوئی علامت نہ تھے۔ موسم سرما میں چوں کہ پاکستان کے پہاڑی علاقوں میں طویل طویل بارشیں ہوتی ہیں جس کی وجہ سے چھت ٹپکنے کا خطرہ بھی ہوتا ہے اور کچے آبادیاں خطرے میں ہوتی ہیں لیکن بعض اوقات طویل بارش کی وجہ سے گاؤں کے کچے مکانات گر جاتے ہیں جس کی وجہ سے جب بارش طویل ہو جاتی تو گاؤں کے لوگ مختلف روایت کو اپناتے اور یقین بھی کر لیتے کہ اس سے بارش رک سکتی ہے۔ گاؤں میں جب کہ ایک طرف بزرگ علی احمد کی لاش تھی تو دوسری طرف تیز بارش برس رہی تھی۔ بارش کو رکنے کے لیے لوگوں نے کچھ عجیب وغریب حرکات کا سہارا لیا۔ جس کو انجام دیتے وقت وہ خیال کرتے تھے کہ اس سے بارش رک جائے گی۔ اختر رضا سلیمی نے ناول میں یہ افعال شامل کے وہاں کی تہذیب کی صحیح ترجمانی کی ہے۔ جب بارش روکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تو فقیر محمد سمیت اکثر لوگوں نے قمیص الٹی پہن لیا اور بارش میں ادھر ادھر ٹہلنے لگے ۔ لکھتے ہیں:

اتنے میں فقیر محمد نے اپنی قمیض اتار کر الٹی پہنی اور باہر بارش میں نکل گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی کئی دوسرے لوگ بھی اپنی قمیض الٹی پہن کر تیز بارش میں ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔ وہ گھنٹہ بارش میں ٹہلتے رہے اور بارش بدستور جاری رہی۔(۴۸)

ایک اور عجیب روایت جو دیہاتی علاقوں میں موجود تھا وہ کہ جب بارش نہیں رکتی تو گارے کے پتلے بنا کر بارش میں رکھتے اور خیال کرتے کہ ہمارے اس عمل سے بارش رک جاتی ہے اس رسم کو بھی اختر رضا سلیمی نے نقل کیا ہے۔

''بوستان جاؤ وہاں سے مٹی کی کھاری بھر کر لاؤ۔ ایک سفید ریش بزرگ نے ایک

نوجوان کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ اچھا کا کا جی۔ یہ کہہ کر وہ توت کی پتلی شاخوں سے بنی ٹوکری اٹھا کر مکان کے پچھواڑے کی طرف چلا گیا۔ اور کچھ ہی دیر مٹی کی ٹوکری بھر کر لے آیا۔ جو بارش کے باعث گارہ بنی ہوئی تھی اس نے ٹوکری بزرگ کے آگے رکھی۔ اور مکان کے ہرنالے کے نیچے ہاتھ دھونے چلا گیا۔ بزرگ نے مٹی کو مٹھی میں بھینچ کر چھوٹے چھوٹے پتلے بنائے اور فقیر محمد کو بلا کر کہا، جاؤ انہیں چھت پر رکھ آؤ۔ دھیان رکھنا ٹوٹ نہ جائیں اور ہاں سنو۔ انہیں پانی میں نہ رکھنا۔ بنیرے پر رکھنا تاکہ آہستہ گھلیں۔(۴۹)

ایک اور دل چسپ اور عجیب رسم جس کا ذکر ناول میں موجود ہے وہ یہ ہے کہ جب بارش نہ رک رہی ہوں تو کاغذ پر سات گنجے لوگوں کے نام لکھ لیا جائے اور پھر اس کاغذ کو بارش میں بہایا جاتا۔ اس خیال کے ساتھ کہ ہمارے اس عمل کی وجہ سے بارش رک جائے گی۔ اختر رضا سلیمی نے اس حیرت وانگیز کو ناول کا حصہ بنایا ہے لکھتے ہیں؛

بابا! میری ماں کہہ رہی ہے کہ اس پر سات گنجے لوگوں کے نام لکھ کر دو تاکہ انھیں بارش میں بہایا جائے۔ ایک نوجوان لڑکی نے کاغذ کا ٹکڑا اور ایک دوات جس میں مور کا پنکھ رکھا ہوا تھا۔ نور خان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ نور خان نے کاغذ اور پنکھ والی دوات لڑکی کے ہاتھ سے لی اور پنکھ سیاہی میں ڈبو کر لکھنے لگا۔ جمیل خان، رسول بخش، دھمی خان، غزنی خان، جان محمد، عبداللہ خان، نورخان، نام لکھ کر وہ تھوڑی دیر ان پر پھونکیں مارتا اور کچھ پڑھتا رہا۔ پھر کاغذ اور دوات لڑکی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا! ماں سے کہنا کہ انہیں بارش میں ڈالنے سے پہلے اچھی طرح سے سکھا لے اور دیکھنا احتیاط سے لے کر جانا! ایسا نہ ہو سیاہی پھیل جائے۔(۵۰)

توہم پرستی پاکستان کے دیہات میں تو کیا شہروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ اختر رضا سلیمی نے بھی ایک جملہ ایسا لکھا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں کے لوگ بھی درختوں میں دھاگوں کو گرہ لگاتے ہیں۔ اور اس پر یقین رکھتے ہیں۔ لکھتے ہیں؛

جندر کے پچھواڑے واقع کاہو کا بوڑھا درخت جس پر بہت عرصے تک لوگ منتیں

مانگتے آتے رہے ہیں اور اب بھی اس کی شاخوں سے بندھے بے شمار جھنڈے لہرا
رہے ہیں۔ (۵۱)

گاؤں کے اکثر لوگ خاص طور پر بزرگ مرد و خواتین یقین کرتے ہیں کہ انسان کو اپنی موت سے پہلے پتہ چلتا ہے اور وہ ایسے باتیں کر جاتے ہیں جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ دنیا سے جانے والا ہے۔ اس حوالے سے گاؤں کے بزرگ بوڑھے اور بوڑھیاں عجیب وغریب چشم دیدہ کہانیاں سناتے ہیں۔ ناول میں مرکزی کردار ولی خان بابا جمال الدین کے بارے میں کہتا ہے کہ بابا جمال نے کچھ دیر پہلے ہی مجھے اپنی موت سے آگاہ کیا تھا، لکھتے ہیں:

''بابا جمال الدین نے اپنی موت سے کچھ دیر پہلے مجھے اپنی موت کے بارے میں
مطلع کر دیا تھا اگر میں نے اس دن بابا جمال الدین کی موت والے دن لالچ آمیز
تساہل نہ برتا ہوتا تو میں یقیناً اسے آخری سانسیں لیتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔'' (۵۲)

گاؤں میں جنوں اور پریوں کے حوالے سے مختلف قسم کی کہانیاں گردش کر رہی ہوتی ہے ایسی کچھ کہانیاں گھوڑی ڈنیچ نام کے مخلوق کے بارے میں تھی جس پر لوگ یقین کرتے تھے۔ یہ ایسی مخلوق ہوتی ہے جو انسان سمیت ہر قسم کا روپ دھار لیتی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ولی خان کہتا ہے؛

میرے بچپن کے دنوں میں بابا جمال نے گھوڑی ڈنیچ کے حوالے سے مجھے بے شمار
کہانیاں سنائی تھیں۔ گھوڑی ڈنیچ انسانوں کا بھیس بدل کر مجھے اکثر ستاتا اور ڈراتا
رہتا ہے مگر میرا دل مضبوط ہے اس لیے وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ (۵۳)

اس باب میں راقم حدرجہ کوشش کی ہے کہ تہذیبی کے عناصر اور عوامل ناول میں موجود ہیں اس کو پیش کیا جائے جس میں گندھارا تہذیب خاص کر اشوک کی تہذیب اس کے علاوہ لوگوں کے سادہ طرز زندگی خاص کر جب معاشرہ میں پن چکی موجود تھی تو وہاں کی تہذیب کیسی تھی۔ اب جبکہ مشین آیا ہے تو جدید اور قدیم تہذیب میں کیا فرق ہے۔ جس کو میں نے واضح کیا ہے۔ اس کے علاوہ لوگوں کے اساطیری خیالات اور توہمات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ جو ناول میں موجود ہیں۔ کیوں کہ اسطورہ بھی تہذیب کا اہم عنصر ہے۔ ہر قوم کے اپنے اپنے اسطوراتی خیالات وعقائد ہوتے ہیں۔ جو اس تہذیب میں خون کی طرح گردش کرتے

رہتے ہیں۔ اور لوگوں کی زندگیوں، خیالات و احساسات، عقائد و عبادات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

گاؤں اور پرانے تہذیب کی ایک جاندار عنصر اجتماعیت تھی جس پر تفصیل سے بات کی گئی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اختر رضا سلیمی، جندر، رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص ۲۱

۲۔ اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں، شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۵۴

۳۔ قدرت اللہ فاطمی، (مضمون) پاکستانی ثقافت کی بنیادیں ڈاکٹر رشید امجد مرتبہ، پاکستانی ثقافت، ص ۱۳۶

۴۔ اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں، شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، ۲۰۱۵ء، س ۱۷۶-۱۷۷

۵۔ ایضاً، ص ۱۷۷

۶۔ ایضاً، ص ۱۵۸

۷۔ صاحبزادہ مسعود الحسن خان، صابری، قدیم دنیا کی تاریخ و تہذیب ص ۱۳۹

۸۔ اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں، شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، ص ۶۷

۹۔ ایضاً، ص ۱۴۶

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۵۳

۱۱۔ پاکستان کے آثار قدیمہ، شیخ نوید اسلام، بک ہوم، مزنگ روڈ، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۷۷-۷۹

۱۲۔ اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں، ص ۱۵۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۵۴

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۵۵

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۵۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۵۵

۱۷۔ ول ڈیورانٹ، انسانی تہذیب کا ارتقاء، مترجم تنویر جہاں، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۳۵

۱۸۔ ایضاً، ص ۳۵

۱۹۔ اختر رضا سلیمی، جندر، ص ۴۱

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۱

۲۱۔ ایضاً، ص ۴۱

۲۲۔ ایضاً، ص ۴۳

۲۳۔ ایضاً، ص ۴۳

۲۴۔ اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں، ص ۸۴

۲۵۔ ایضاً، ص ۶۵

۲۶۔ ایضاً، ص ۶۶

۲۷۔ ایضاً، ص ۶۶

۲۸۔ ایضاً، ص ۶۶

۲۹۔ ایضاً، ص ۷۰

۳۰۔ اختر رضا سلیمی، جندر، ص ۲۱-۲۲

۳۱۔ ایضاً، ص ۲۲

۳۲۔ ایضاً، ص ۲۳

۳۳۔ ایضاً، ص ۲۳

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۳-۲۴

۳۵۔ ایضاً،ص۲۴

۳۶۔ ایضاً،ص ۲۵

۳۷۔ ایضاً،ص ۳۷

۳۸۔ ایضاً،ص ۹۷

۳۹۔ ایضاً،ص ۹۸

۴۰۔ ایضاً،ص ۹۸

۴۱۔ ایضاً،ص ۹۸

۴۲۔ ایضاً،ص ۹۸

۴۳۔ ایضاً،ص ۹۷

۴۴۔ اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں،ص۶۰

۴۵۔ ایضاً،ص۶۰

۴۶۔ ایضاً،ص۶۲

۴۷۔ ایضاً،ص۶۳

۴۸۔ ایضاً،ص۶۳

۴۹۔ ایضاً،ص۶۴

۵۰۔ ایضاً،ص ۶۵

۵۱۔ ایضاً،ص۳۰

۵۲۔ ایضاً،ص ۴۵

۵۳۔ ایضاً،ص ۴۸

ماحصل

ناول اس وقت دنیا کی سب سے مقبول ترین صنف ہے ،جس کا بخوبی اندازہ نوبل انعام یافتگان ی فہر ست سے لگایا جا سکتا ہے۔اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ موجودہ صنعتی دور کی پیچیدگیوں کو یہی صنف سخن بہتر طور پر سہار سکتی ہے۔ اردو میں اگر چہ ناول کی صنف بہت بعد میں آئی لیکن اردو میں ناول کا قصہ اب اتنا نیا بھی نہیں ہے ۔دنیا کی دیگر بڑی زبانوں کی طرح اردو زبان میں بھی بہت عمدہ ناول لکھے گئے۔ پہلا باقاعدہ ناول مرۃ العروس کو مانا جاتا ہے جو ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔ یوں ۲۰۱۹ء میں اردو ناول کی عمر پورے ڈیڑھ سو سال ہوگئی ہے۔ اس ڈیڑھ صدی میں ، اس صنف نے اُردو ادب کو قابلِ فخر سرمایہ دیا ہے۔درجنوں ایسے ناول لکھے گئے ہیں جس نے ہمارے اُردو ادب کے دائرے کو وسیع کیا ایسا ہی ایک ناول اختر رضا سلیمی کا جاگے ہیں خواب میں بھی ہے جو ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا۔

اختر رضا سلیمی کا یہ ناول ایک ایسا ناول ہے جس نے شائع ہوتے ہی پوری اردودنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ کچھ نقاد اسے اردو ناول کا ایک اہم موڑ قرار دے رہے ہیں تو کچھ کے نزدیک یہ اردو ناول کا ایک اہم سنگ میل ہے۔کسی نے اسے اردو ناول کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ قرار دیا تو کسی نے اردو میں جادوئی حقیقت نگاری کی سب سے اعلیٰ مثال۔ لحہ موجود کے اردو کے اہم ترین فکشن نگار مستنصر حسین تارڑ کے الفاظ میں : جاگے ہیں خواب میں ناول نگاری کے فن میں ایک حیرت انگیز جست ہے۔۔۔یہ اردو ناول نگاری کا وہ خواب ہے ، جسے ہم ایک مدت سے دیکھ رہے تھے، اب اس کی آمد پر کھڑے ہو کر،ہمیں اس کا استقبال کرنا چاہیے۔

ناول میں متنوع موضوعات پر مباحث کی گئی ہیں جن میں تاریخ، تہذیب، سائنس، طبیعیات، ابعد الطبیعیات، فلسفہ، نفسیات، اساطیر اور اجتماعی لاشعور شامل ہیں۔ اس وجہ سے ہم اس کو کثیر الجہت یا پھر کثیر الموضوعاتی ناول کہہ سکتے ہیں۔ناول کے ایک بہت اہم ناقد ممتاز احمد خان کے الفاظ میں:

جاگے ہیں خواب میں کو اردو ناول کی دنیا میں مرزا ہادی رسوا سے لے کر، عزیز احمد، قرۃ العین حیدر اور مرزا اطہر بیگ تک کے ارتقائی سفر میں ایک علاحدہ شناخت کے حامل ناول کی حیثیت سے یاد رکھے جانے کا قطعی امکان ہے ۔۔۔۔ یہ ایک کثیر جہتی ناول ہے اوراس کے حوالے سے کئی مزید مباحث اٹھائے جانے ضروری ہیں۔فرائڈ نے لاشعور اور خوابوں کے حوالے سے جو تصور دیا تھا اس کے حوالے سے تو اردو ادب میں

بہت کچھ لکھا گیا لیکن ژونگ کے نظریہ لاشعور اور نظریہ خواب کے حوالے سے میری معلومات کی حد تک یہ پہلا ناول ہے۔''

اس ناول کے حوالے سے ایک اہم بات یہ بھی ہے یہ دنیا کا پہلا ناول ہے جس کے لیے ایک ہزار ایک مختلف سرورق بنائے گئے یوں اس کے پہلے ایک ہزار ایک نسخوں کا ٹائٹل نہ صرف اوریجنل پینٹنگ پر مشتمل تھا بل کہ ایک دوسرے سے مختلف بھی تھا۔ یہ تمام ٹائٹل ممتاز مصور اور اختر رضا سلیمی کے دوست وصی حیدر نے آٹھ ماہ کی مسلسل محنت سے بنائے ۔ بی بی سی اردو کے مطابق کتابوں کی دنیا میں یہ اپنی نوعیت کا واحد تجربہ ہے اور اسے گنز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں آنا چاہیے۔

ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ یہ ناول اس لیے بھی بہت زیادہ توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہا کہ یہ اپنے اسلوب کے ساتھ ساتھ تکنیک کے حوالے سے بھی اردو میں ایک نیا تجربہ تھا۔ جسے سمجھنے کے لیے اس کی کہانی پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔اس ناول کی کہانی کچھ یوں ہے:

زمان ناول کا مرکزی کردار ہے جو بنیادی طور پر ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔جس کے آباو اجداد پچھلی سات آٹھ پشتوں سے سماجی طور پر انتہائی اثر و رسوخ کے مالک رہے ہیں۔اس نے اپنے بچپن کا کچھ حصہ اپنی آبائی حویلی نور آباد میں گزار رکھا ہے۔ بعد میں اس کے والد اسے اچھا تعلیمی ماحول فراہم کرنے کے لیے اسلام آباد منتقل ہو جاتے ہیں۔دوران تعلیم اس کی دلچسپی طبیعیات میں ہوتی ہے اور وہ ہر چیز کو عقل اور تجربے کی کسوٹی پر پرکھ کر ہی قبول کرتا ہے لیکن ایک خواب ، جو اسے بار بار آتا ہے ،وہ اسے مابعدالطبیعیات میں دلچسپی کی طرف مائل کرتا ہے۔وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ کسی پہاڑ کے دامن میں واقع ایک غار کی چھت پر لیٹا آسمان پر چمکتے ستاروں سے لطف اندوز ہورہا ہے اور اس غار کی پتھریلی چھت پر ، جہاں وہ لیٹا ہوا ہے ،کچھ مبہم سی لکیریں ہیں انسانی ہتھیلی پر بنی لکیریوں سے مماثل ہیں۔ ایک مرتبہ وہ یونیورسٹی میں ہونے والی سردیوں کی چھٹیاں گزارنے اپنے گاؤں آتا ہے ۔رات کو اس کی جوں ہی آنکھ لگتی ہے وہی خواب پھر عود کر آتا ہے ، اس فرق کے ساتھ کے اس میں ہر منظر واضح ہوتا ہے۔خواب کے تمام مناظر حویلی کے عقب میں موجود پہاڑ کے مناظر پر مشتمل ہوتے ہیں صبح اٹھتے ہی وہ اپنے خواب کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوتا ہے ۔

جب وہ غار کی چھت پر پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے کہ یہاں کے تمام مناظر بالکل ویسے ہی ہیں جیسے اس نے خواب میں دیکھے تھے۔ جب وہ غار کی چھت پر موجود لکیروں کو بغور دیکھتا ہے تو وہ حیرت انگیز طور پر، اس کی بائیں ہتھیلی کی لکیروں سے مماثل ہوتی ہیں۔ یہاں سے اس کی زندگی مکمل طور پر بدل جاتی ہے۔ اسی دوران میں وہ اپنی کلاس فیلو ماہ نور کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔عشق میں ناکامی کے بعد وہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ گاؤں چلا جاتا ہے ۔

اب وہ طبیعیات کو چھوڑ کر مابعدالطبیعیات میں دلچسپی لینا شروع کر دیتا ہے ۔گاؤں ہی میں اس کی ملاقات عرفان نامی ایک شخص سے ہوتی ہے جو اسے بتاتا ہے کہ'' آدمی جیسا سوچتا ہے ویسا ہی رونما ہوتا ہے اور یہ کہ ہماری سوچ ہمارے معروض پر اثرانداز ہوتی ہے۔''

گاؤں میں منتقلی کے بعد وہ سارا دن غار کی چھت پر گزارتا ہے اور شام کو بستی کی طرف پلٹا ہے۔

البتہ ہر ماہ پورے چاند کی تین چار راتیں بھی وہیں گزارتا ہے۔خاص کر ایسی راتیں جن میں تمام علاقہ برف سے ڈھکا ہوتا ہے ۔اسے برف پر پڑتی چاندنی سے عشق ہوتا ہے ۔ایسی ہی ایک رات، جب برف باری کے بعد چاند اپنے پورے جوبن پر ہوتا ہے اور وہ غار کی چھت پر لیٹا برفانی نظارے سے لطف اندوز ہو رہا ہوتا ہے کہ اچانک زلزلہ آجاتا ہے ۔جس کے باعث غار کی چھت عین اس مقام سے دولخت ہو جاتی ہے جہاں اس کی بائیں ہتھیلی میں موجود دماغ کی لکیر سے ملتی جلتی لکیر ہوتی ہے ،جس کے نتیجے میں وہ غار کے اندر جا گرتا ہے اور بے ہوش ہو جاتا ہے۔دوسرے دن اسے بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لایا جاتا ہے۔تشخیص کے بعد پتا چلتا ہے کہ وہ کومے میں چلا گیا ہے۔کومے کے دوران میں وہ ایک طویل خواب دیکھتا ہے، جس کے ہر منظر میں وہ اپنے جینز میں پیچھے کی طرف سفر کرتا ہے ۔ اپنے دادا ، پردادا اور لکڑدادا سے ہوتا ہوا وہ اپنی بیاسویں (۸۲) پشت کے کردار میں جا ڈھلتا ہے ، جہاں وہ مہاراجہ اشوک کے عہد میں اس کا ایک ملازم ہوتا ہے۔وہ مہاراجہ اشوک کا ایک فرمان ایک چٹان پر کندہ کرا رہا ہوتا ہے کہ اسے ہوش آجاتا ہے۔جب اسپتال میں اس کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ اپنے آپ کو ایک اجنبی دنیا میں پاتا ہے۔ دراصل وہ اپنا ماضی کھو بیٹھتا ہے اور خواب میں دیکھے ہوئے مناظر اس کا ماضی بن جاتے ہیں۔یوں اسے یہ دنیا کوئی طلسمی دنیا لگتی ہے ۔وہ وہاں سے نکل کر واپس مہاراجہ اشوک سے ملنے اور فرمان کے چٹان پر کندہ ہونے کی رپورٹ دینے کے لیے ،وہاں سے بھاگنے کا منصوبہ بناتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے۔

ایک دن وہ حویلی کی چھت سے عقبی پہاڑ کا نظارہ کرتا ہے تو اسے پہاڑ کے کچھ مناظر دیکھے بھالے سے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ چپکے سے ادھر کو کھسک جاتا ہے، اس کا چھوٹا بھائی فرمان (جو موجودہ سٹیٹ آف مائنڈ میں اس کے لیے اجنبی ہوتا ہے)جب اسے ادھر جاتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ بھی اس کا پیچھا کرتا ہے ۔اچانک زمان کی نظر بستی کے پچھواڑے واقع ایک میدان کے سرے پر ایستادہ چٹان پر پڑتی ہے ۔ وہ قریب جا کر دیکھتا ہے تو حیرت سے مبہوت ہوکر رہ جاتا ہے۔ یہ وہی چٹان ہوتی ہے ،جس پر اس نے مہاراجہ اشوک کا فرمان کندہ کیا ہوتا ہے۔لیکن اس سے بھی حیرت انگیز بات یہ ہوتی ہے کہ چٹان وہاں نہیں ہوتی، جہاں فرمان کندہ کرتے وقت واقع تھی ۔وہ اس مخمصے میں پڑ جاتا ہے کہ چٹان یہاں کیسے پہنچی۔ اس کا بھائی یہ سب کچھ دیکھ رہا ہوتا ہے۔ وہ بھی چٹان پر لکھی ہوئی نامعلوم عبارت دیکھ کر دھنگ رہ جاتا ہے ۔شام کو وہ یہ ساری کہانی اپنے والد عزیز خان کو سناتا ہے۔ عزیز خان کو پہلے تو یقین نہیں آتا لیکن جب وہ خود چٹان کو دیکھتے ہیں تو وہ بھی حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔اگلے روز

وہ قدیم زبانوں کے ماہر ڈاکٹر کلیم کو بلواتے ہیں ۔ ڈاکٹر کلیم چٹان پر کندہ عبارت دیکھتے ہی کہہ دیتے ہیں کہ یہ مہاراجہ اشوک کا،ان چودہ فرمانوں میں سے ساتواں فرمان ہے، جو اس نے اپنے دورِ حکومت میں(آج سے تیئس سو سال پہلے) مختلف علاقوں میں کندہ کرائے تھے۔ اگلے روز وہ ایک بڑے اخبار میں اس پر ایک تحقیقی مقالہ بھی لکھتے ہیں۔

اسی دوران میں سردار عزیز خان کے دوست اور ملک کے ممتاز ماہر نفسیات ڈاکٹر مسیح الدین فاروقی بیرون ملک سے تشریف لاتے ہیں ۔عزیز خان انھیں ساری کہانی سناتے ہیں اور ساتھ ہی انھیں ڈاکٹر کلیم کا مضمون بھی دکھاتے ہیں ۔ ڈاکٹر فاروقی رات بھر زمان کی مختلف میڈیکل رپورٹس کا مطالعہ کرتے ہیں اور ساتھ ہی ڈاکٹر کلیم کے تحقیقی مضمون کا بھی۔

اگلے دن وہ مہاراجہ اشوک کے ملازمین جیسا لباس پہن کر زمان سے تنہائی میں ملتے ہیں۔ زمان ان کا لباس دیکھ کر ان سے کھل جاتا ہے کہ اس کے خیال میں یہی شخص اسے ، اس کے اپنے ملک بھیج سکتا ہے ،اور اپنی ساری کہانی، جس کا بیشتر حصہ مہاراجہ اشوک کے دربار سے ، اس کی وابستگی ،اور بالاکوٹ میں مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان ہونے والی جنگ (یہ جنگ ۱۸۳۱میں ہوئی تھی) کے بارے میں ہوتا ہے ،انھیں سناتا ہے۔اس کے بعد ڈاکٹر فاروقی ،عزیز خان سے، ان کے آبا اجداد کی تاریخ مختلف ادوار میں ان کے کارناموں اور ان کے مزاج کے حوالے سے پوچھتے ہیں۔جب انھیں پتہ چلتا ہے کہ ان کے نکڑ دادا نے بالاکوٹ کی جنگ میں بنیادی کردار ادا کیا تھا تو وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ زمان نے دوران خواب اپنے جینز میں الٹا سفر کیا ہے۔وہ باپ دادا سے ہوتا ہوا ، مہاراجہ اشوک کے عہد میں موجود اپنے جد امجد تک پہنچا ہے۔یوں اس نے جو منظر سب سے پہلے دیکھا وہ اس کا ماضی بعید ہے اور جو سب سے آخر میں دیکھا وہ اس کا ماضی قریب ۔سر دست اسے بالاکوٹ کی جنگ سے آگے کا کوئی منظر یاد نہیں، اگر کسی طرح اسے وہ پہلا منظر یاد آجائے تو اسے اس خواب سے باہر حقیقت کی دنیا میں لایا جا سکتا ہے۔چناں چہ وہ ہر روز اس سے تنہائی میں ملتے ہیں اور عزیز خان کی بیان کی ہوئی خاندانی روایات کے سہارے، اسے منظر یاد دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ایک دن اسے زلزلے کی رات والا منظر یاد آجاتا ہے ،یہ منظر یاد آتے ہی وہ دوبارہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔ جب اسے پھر سے ہوش آتا ہے تو وہ سب کو پہچاننے لگتا ہے ۔ اب وہ نہ صرف کومے کے دوران میں دیکھا جانے والا خواب بھول جاتا ہے بل کہ کومے سے باہر آنے کے بعد گزشتہ سوا تین ماہ کے دوران میں ،جو واقعات رونما ہوئے ہوتے ہیں ،وہ بھی اس کے ذہن سے محو ہوجاتے ہیں۔ان واقعات پر پردہ ڈالنے کے لیے اسے بتایا جاتا ہے کہ وہ مسلسل چار ماہ کومے میں رہا ہے۔

کہانی میں ایک اور نیا موڑ اس وقت آتا ہے جب زمان اس واقعہ کے سات ماہ بعد گاؤں آتا ہے اور اس چٹان کو دیکھتا ہے ،جس پر مہاراجہ کا فرمان کندہ ہوتا ہے۔ چٹان پر اس کی نظر پڑتے ہی وہ خروشتی رسم الخط(وہ

رسم الخط جو مہاراجہ اشوک کے دور میں مروج تھا اور جو ساتویں صدی عیسوی کے بعد معدوم ہو گیا) میں لکھی عبارت کو فرفر پڑھ لیتا ہے۔ وہ خوف زدہ ہو کر گھر کی راہ لیتا ہے۔وہ ساری رات اس کشمکش میں گزارتا ہے کہ اس نے ایک ایسے رسم الخط میں لکھی عبارت کیسے پڑھ لی جو ایک عرصہ ہوا معدوم ہو چکی ہے۔ پھر اسے لگتا ہے جیسے عبارت پڑھنا اس کا وہم تھا۔

اس وہم کو دور کرنے کے لیے وہ اگلے روز دوبارہ وہاں جاتا ہے اور یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ وہ یہ عبارت واقعی پڑھ سکتا ہے۔ وہ اسی حیرت سے چٹان کو دیکھ رہا ہوتا ہے کہ اسے وہاں ایک لاش گرتی ہوئی نظر آتی ہے وہ یہ منظر دیکھ کر گھبرا جاتا ہے اور گھر کی طرف دوڑ لگا دیتا ہے۔

کچھ ہی دنوں بعد جاگتی آنکھوں سے دیکھا گیا اس کا یہ خواب سچا ثابت ہو جاتا ہے اور لوگ، اس کے ایک قریبی عزیز کی لاش وہیں سے اٹھا کر لاتے ہیں۔ اس کے بعد مستقبل میں پیش ہونے والے واقعات خاص کر اپنے عزیزوں کی موت وہ پہلے ہی دیکھ لیتا ہے۔ وہ اپنے تمام قریبی عزیزوں کی موت کا منظر ،جس طرح دیکھتا ہے ،ان کی موت اسی طرح واقع ہوتی ہے۔

ایک دن وہ اپنی معمول کی سیر کو نکلا ہوتا ہے کہ اپنی ماں کی موت کا منظر دیکھتا ہے۔گھر واپس آتا ہے تو ماں کو دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے۔ اس پریشانی کو دور کرنے کے لیے وہ رات کو غار پر جانے کا پروگرام بناتا ہے۔ لیکن اب کی بار وہ غار پر جانے کے بجائے غار کے نشیب میں واقع دو چٹانوں میں سے بائیں سمت والی چٹان پر بیٹھ کر خلاؤں میں گھورتا رہتا ہے۔ رات کو پچھلے پہر جب تھکا ہارا گھر پہنچتا ہے تو بستر پر لیٹتے ہی اسے نیند آجاتی ہے۔آنکھ لگتے ہی وہ ایک عجیب وغریب خواب دیکھتا ہے۔وہ دیکھتا ہے کہ وہ مر چکا ہے اور لوگ رو رہے ہیں۔ اس کی ماں اس کی لاش کو دیکھتی ہے تو وہ بھی چل بستی ہے۔ لوگ ان دونوں کے جنازے اٹھائے قبرستان میں جاتے ہیں ۔نمازِ جنازہ پڑھنے کے بعد پہلے اس کی ماں کی لاش قبر میں اتارتے ہیں اسے دفن کرنے کے بعد اس کی لاش اٹھاتے ہیں۔ جب وہ اپنی لاش کو دیکھتا ہے تو اسے اس سے گھن سی آتی ہے اور اسے یہ جان کر خوشی ہوتی ہے کہ وہ اپنے بدن میں موجود نہیں۔

اور حقیقت بھی یہی ہوتی ہے کہ وہ مر چکا ہوتا ہے۔ناول کا اختتام زمان کی موت کے ٹھیک ایک سال بعد کے ایک منظر پر ہوتا ہے جس میں اس کا دودھ پیتا بچہ(جو اس کی موت کے بعد پیدا ہوتا ہے)حویلی کے صحن میں لیٹا ستاروں بھرے آسمان پر نظریں جمائے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ اپنے مرحوم باپ کی طرح اس کا پلکیں جھپکنے کا دورانیہ بھی معمول سے دگنا ہے اور اس کی بائیں ہتھیلی میں، پیدائشی طور پر،ایک مندمل ہو چکے ایک زخم کا باریک سا نشان ہے۔“

اس خلاصے سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس ناول میں تاریخ وتہذیب کن کن حوالوں سے کارفرما ہے۔ اشوک کے دور سے لے کر سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد اور سکھوں و انگریزوں کے تسلط کے ساتھ ساتھ ۲۰۰۵ء کے زلزلے سے تک کا بھی ذکر موجود ہے۔تاریخ و تہذیب کے مباحث اس ناول کا بنیادی حصہ ہیں۔خاص کر گندھارا، تہذیب کی جس انداز میں عکاسی کی گئی ہے وہ قابلِ رشک ہے۔ اشوک اعظم نے جب بدھ مت اختیار کیا تو کس طرح وہ عدم تشدد کا علمبردار بنا۔ اس نے اپنی وسیع سلطنت میں بین المذہب ہم آہنگی کو کس طرح فروغ دیا۔ان سب کی عکاسی اختر رضا سلیمی نے بڑی مہارت سے کی ہے۔

اس ناول میں سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس میں کئی، ایسے پہلوؤں کو واضح کیا گیا ہے جو ابھی تک لوگوں سے پوشیدہ تھے جیسے سید احمد بریلوی کی تحریک نے جب پشتونوں کے کلچر کو ختم کرنا چاہا تو پشتونوں نے اُن کے خلاف بغاوت کر دی اور سید احمد بریلوی کو پشاور چھوڑنا پڑا۔

ناول بنیادی طور یہ واضح کرتا ہے کہ ایک نسل کے اثرات دوسری نسل پر جینیاتی طور پر کس طرح ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اس ناول ژونگ کے نظریہ لاشعور کا اثر ہے۔ ناول نگار نے انسانی ذہن کے پیچیدگی کو ظاہر کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ مادی دنیا کو تسخیر کرنے والا انسان خود اپنے اندر سے کتنا نا واقف ہے ۔ ناول کو دیکھ کر قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ انسانی ذہن کتنا پیچیدہ ہے اور ابھی تک اس کے بہت کم حصے کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

ناول کی کامیابی کی ایک اور وجہ اس ناول کے خوبصورت مناظر ہیں جس میں جا بجا خوبصورت وادیاں ، پُر پیچ پہاڑ،دریا ہرو کی جولانی، شور مچاتے ہوتے آبشاریں اور صاف شفاف چشمے و ندیاں کی طلسماتی ماحول ہے جو انسان کو مبہوت کر دیتا ہے اور کئی دن تک قاری اس ناول کے سحر سے نہیں نکل سکتا۔

اختر رضا سلیمی نے ناول میں اُن اساطیری کہانیوں کا بھی ذکر کیا ہے جو کہ ہمارے تہذہب کا حصہ ہے اور لوگ اس پر یقین بھی رکھتے ہیں۔ ہر تہذیب کے اپنے اساطیر ہوتے ہیں۔ بیسویں اور اکیسویں صدی میں نیچرل سائنس نے اگر چہ بہت ترقی کی ہے اور اس زمانے کا انسان سائنسی بنیادوں پر سوچتا ہے اور سائنسی طرز فکر سے متاثر ہے۔لیکن اس کے باوجود دنیا کی ترقی پذیر ممالک کے ساتھ ساتھ ترقی یافتہ ممالک کے لوگ بھی اساطیر پر ابھی تک یقین رکھتے ہیں اس وجہ اسطورہ بھی تہذیب کا حصہ ہے۔ اختر رضا سلیمی نے پاکستانی معاشرے میں موجود اساطیری کہانیوں کا ذکر کیا ہے جس سے ناول کی دل چسپی میں اضافہ ہوا ہے۔

ناول ۲۰۰۵ء کے زلزلے سے شروع ہوتا ہے جب ناول کا مرکزی کردار زمان چوٹ لگنے سے کومے میں چلا جاتا ہے اور کومے میں کسی اور دنیا میں چلا جاتا ہے وہ ڈھائی ہزار سال پیچھے سفر کرتا ہے اور اشوک اعظم کے دور میں چلا جاتا ہے جب زمان اشوک کے حکم پر ٹیکسلا کے کسی مقام پر شاہراہ عام میں چٹان پر اشوک کا فرمان کندہ کرا رہا ہوتا ہے اس زمانے میں برصغیر اُمن و آشتی کا مرکز تھا اور دنیا بھر سے طلباء علوم کے تحصیل کے لیے ٹیکسلا آتے تھے جو کہ مرکزی شہر تھا۔

اختر رضا سلیمی نے اس ناول میں جو تکنیک استعمال کیا ہے وہ اُردو ناول میں بہت کم استعمال ہوا ہے یعنی مرکزی کردار زمان کومے کے حالت میں حال سے ماضی کا سفر کرتا ہے اور پھر جب وہ ہوش میں آتا ہے تو ڈاکٹر اس کو ماضی سے حال میں لے آتے ہیں۔ اس ناول کی کامیابی کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں جو تکنیک برتی گئی ہے وہ بہت اہم ہے کیوں کہ یہ تکنیک اردو کے دوسرے ناولوں میں بہت کم استعمال ہوا ہے۔

ہوش میں آنے کے بعد جب زمان پر مستقبل میں آنے والے حالات آشکارا ہوتے ہیں۔وہ ماہ نور، اپنی بیوی اور چچا گل زیب کے ساتھ آنے والے واقعات کا قبل از وقت ادراک حاصل کرتا ہے۔ حال میں رہتے ہوئے وہ مستقبل میں آنے والے واقعات کی درست نشان دہی کرتا ہے۔

ناول میں فطری مناظر کی عکاسی اسی دلکشی سے کی گئی ہے کہ قاری ناول کو پڑھ کر قدرتی مناظر کے سحر میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ حاص دریائے ہرو کی جولانی اس کا پاک وشفاف پانی ہزارہ کی پہاڑوں کے سینے سے نکلتے ہیں۔ناول نگار کے ہاں دریائے ہرو تہذیب کا استعارہ ہے۔جس کے سینے میں ہزارہ کی ہزاروں سالہ تاریخ دفن ہے۔

راقم کا موضوع ناول کا تاریخی اور تہذیبی مطالعہ تھا۔اگر چہ اس ناول کی کئی دیگر جہت بھی ہیں۔ جیسا کہ ناول میں موجود سائنسی مباحث،وقت کے حوالے سے سادھو آنند کے نظریات ، کائنات کی وسعت روشنی کی رفتار ،ستاروں اور سیاروں کی حرکت، تمام انسانوں میں اجتماعی لاشعور کی کار فرمائی، جنیاتی اثرات کس طرح اپنا اثر دکھاتے ہیں۔انسانی ذہن کی پیچیدگی اور اسی طرح بہت سارے دیگر موضوعات پر ناول میں بحث کی گئی ہے۔ یہ موضوعات یوں کہ بہت پیچیدہ اور گہرے مطالعے ومشاہدے کے محتاج ہے۔اس وجہ سے راقم نے ان موضوعات میں سے چند کو اگر چہ مختصر طور پر دیکھا ہے۔ اگر چہ راقم کا اپنا موضوع ناول کا تاریخی اور تہذیبی مطالعے تک محدودتھا۔ اس وجہ سے ناول میں موجود تاریخی شعور کی کارفرمائی کو دیکھا ہے۔ جس میں زیادہ اہم ٹیکسلا کا پرانی

تاریخی وتہذیبی مقام ہے۔جو کہ برصغیر کی لوگون کے لئے قابل فخر ہے۔

ناول میں اشوک اعظم اور اس کے سلطنت کے مباحث کافی دل چسپی کا باعث ہے۔300 قبل مسیح میں جب دنیا میں جہالت کی تاریکیاں تھی۔ یونان کی علاوہ کہی بھی علم وادب کی روشنی نہ تھی۔ایک ایسے دور میں اشوک برصغیر پر حکومت کر رہا ہوتا ہے۔ وہ گوتم بدھ کا پیروکار اور عدم تشدد کا علمبردار ہے۔اس کی چالیس سالہ دور حکومت میں ہندوستان ایک فلاحی مملکت بن چکا تھا۔اُس نے مذہبی ہم آہنگی مساوات اور امن واشتی کوفروغ دیا۔

انیسوی صدی میں جب کہ انگریز پورے ہندوستان پر قابض ہوچکے تھے۔اور ہندوستا ن زوال اور اندرونی انتشار کا شکار تھا۔ سید احمد بریلوی ایک مسلم سلطنت کا خواب لیکر اٹھے۔اور اپنے اس خواب کی تکمیل کیلئے شمال مغربی سرحدی علاقوں کا رخ کیا۔ پشاور کے پٹھا ن قبیلوں نے اس کے ہا تھ پر بیعت کیے۔لیکن سید احمد بریلوی نے جب اُن کی کلچر وکو چھیڑا تو انہوں نے بغاوت کیا اور سید احمد بریلوی کو مجبوراً بالاکوٹ جانا پڑا۔یہاں ناول نگار یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ کہ کلچر لوگوں کیلئے ایک مقدس چیز ہے۔ وہ کبھی کبھی اپنے کلچر بھی کبھی سجھوتہ نہیں کرتے۔ ناول میں سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد کا بالاکوٹ میں ناکامی کا بھی ذکر موجود ہے۔ یہ تحریک ہندوستان کے مسلمانوں کیلئے احیائے مذہب کی ایک مقدس تحریک تھی۔

ناول میں دیگر مباحث کے ساتھ ساتھ ناول نگار ہمارے دیہات کے ناقابل یقین اساطیری مظاہر کا ذکر وقت بروقت کرتے ہیں۔ جس کو دیکھ کر قاری کو اپنے تہذیب سے محبت ہونی لگتی ہے۔ جیسے گاؤں کے لوگوں کی اجتماعیت ، کے وہ ہر مصتیبت کا مقابلہ مشترکہ طور پر کرتے ہیں۔بزرگ لوگوں کا ادب ، جب بارش رکھنے کا نام رہا تھا۔تو انھیں مختلف افعال کا مظاہرہ کیا جس سے وہ سمجھتے تھے کہ بارش رک جائی گی۔مثلاً چہرے پر کالک ملنا ،قمیص الٹا پہن کر بارش میں گھومنا ، گنجے لوگون کے نام لکھ کر بارش میں بہانا اور اس طرح کے دیگر تہذیبی مظاہر کو دیکھ کر قاری کو پاکستانی تہذیبی مظاہر سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

راقم نے سلیمی صاحب کا دوسرا نیا شائع شدہ ناول جـــــندر کو بھی مختصر طور پر تہذیبی حوالے سے دیکھا ہے۔اس ناول کا نام ہی قدیم تہذیب سے لگاؤ کا ایک استعارہ ہے۔پرانے اور جدید تہذیب کے درمیا ن حد فاصل جندر یعنی پن چکی تھی۔ جب معاشرے میں جندر موجود تھا تو لوگ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوتے تھے۔اور لوگ گاؤں کے مسائل مشترکہ طور حل کرتے تھے۔ کیوں کہ یہ لوگوں مجبوری تھی۔

اختر رضا سلیمی نے اپنے دوسرے ناول جندر میں قدیم اور جدید تہذیب کے درمیان موازنہ کیا ہے۔ اس میں ایک کردار بابا جمال الدین کا ہے۔ جو قدیم داستانوں کی تہذیب کا ترجمان ہے۔ بابا جمال الدین کو سینکڑوں کہانیاں دیا رہے۔ ناول کا مرکزی کردار ولی خان ہے۔ جو جندر میں کام کرتا ہے۔ لیکن گاؤں میں تھریشر آجاتا ہے۔ تو ولی خان کا کام کمزور ہوجاتا ہے۔ اور لوگ مشین کے ذریعے اب گندم پیستے ہیں۔ ولی خان کو جندر میں گھومتے پاٹوں کے بغیر نیند نہیں آتی وہ چونک بھی گندم جندر میں ڈالتا اور پھر سوجاتا۔ لیکن جب جندر میں آٹا آنا بالکل بند ہوگئے تو ولی خان کی نیندیں اڑ گئے۔ حتٰی کہ اس کی موت ہوگئی۔

ناول میں سلیمی صاحب شاید یہ ظاہر کررہے ہیں کہ جدید تہذیب یا وہ تہذیب جس کا انحصار مشینوں پر ہوں وہ انسانیت کے لئے ہلاکت کا باعث ہے۔

ہے دل کیلئے موت مشینوں کی حکومت

احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

ناول میں تاریخ و تہذیب کی زبردست کارفرمائی اور دیگر موضوعات پر مباحث کی وجہ سے ضروری تھا کہ اس پر مقالہ لکھا جاتا۔

کتابیات

☆ احتشام حسین۔ مضمون ادب اور کلچر مشمولہ ''کلچر'' از اشتیاق احمد بیت الحکمت لاہور ۲۰۰۷ء

☆ اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، ۲۰۱۵ء

☆ اختر رضا سلیمی، جندر، رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء

☆ اعجاز راہی۔ تاریخِ خطاطی ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ راول پنڈی ۱۹۸۶ء

☆ امام مسلم بن حجاج القسیری۔ صحیح مسلم المیز ان اردو بازار لاہور ۲۰۰۴ء

☆ تارا چند، ڈاکٹر۔ تمدنِ ہند پر اسلامی اثرات مجلسِ ترقی ادب لاہور ۲۰۰۰ء

☆ جعفر ندوی۔ مقالات ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور ۱۹۶۷ء

☆ جمیل جالبی، ڈاکٹر۔ (مترجم) برِّ صغیر میں اسلامی کلچر ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور ۱۹۹۰ء

☆ جمیل جالبی، ڈاکٹر۔ پاکستانی کلچر نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۱۹۹۷ء

☆ خاور جمیل۔ ادب، کلچر اور مسائل رائل بک کمپنی کراچی ۱۹۸۶ء

☆ ڈی ڈی کوسمبی۔ قدیم ہندوستان کی ثقافت و تہذیب، تاریخی پس منظر میں فیمس بکس لاہور ۱۹۸۹ء

☆ رابرٹ بریفالٹ۔ (مترجم: عبدالمجید سالک) تشکیل انسانیت مجلسِ ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ء

☆ زوار حسین۔ تہذیب بیکن بکس ملتان ۲۰۰۰ء

☆ سبطِ حسن۔ پاکستان میں تہذیب کا ارتقا دانیال لاہور، ۱۹۹۶ء

☆ سبطِ حسن۔ پاکستان میں تہذیب کا ارتقا لاہور دانیال لاہور ۱۹۹۶ء

☆ سبطِ حسن۔ مضمون تہذیب سے تمدن تک مشمولہ ''کلچر'' از اشتیاق احمد بیت الحکمت لاہور ۲۰۰۷ء

☆ سلیم اختر، ڈاکٹر۔ مضمون کلچر کی لہریں مشمولہ ''ادب اور کلچر'' مکتبۂ عالیہ لاہور، س ن

☆ شمیم احمد۔ ناول نگاری کا غالب رجحان۔ تخلیقی ادب جلد: ۲ مینا پریس کراچی ۱۹۸۰ء

☆ شہزاد حسین۔(مرتبہ) افسانے نذر سنز لاہور ۱۹۹۲ء

☆ شیخ محمد اکرام۔ پاکستان کا ثقافتی ورثہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور مارچ ۲۰۰۱ء

☆ شیر محمد گریوال۔اسلامیانِ ہند کا شاندار ماضی اسلامی بک سروس لاہور ۱۹۸۹ء

☆ صباح الدین عبدالرحمٰن۔ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے روہتاس بکس لاہور س ن

☆ عمر زبیری، پروفیسر۔قدیم تہذیبیں اور مذاہب دارالشعور لاہور ۲۰۰۹ء

☆ قرۃ العین حیدر۔ آخرِ شب کے ہم سفر سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۰ء

☆ قرۃ العین حیدر۔ آگ کا دریا سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۰ء

☆ قرۃ العین حیدر۔میرے بھی صنم خانے سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۰ء

☆ مبینہ شاہین۔وادیٔ سندھ کی تہذیب کے لوگوں کی ثقافتی تاریخ تحقیقی مقالہ برائے ایم اے تاریخ پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۹۲ء

☆ محمد عمر، ڈاکٹر۔ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر پاک اکیڈمی لاہور ۱۹۹۲ء

☆ محمد مجیب۔تاریخِ تمدنِ ہند نگارشات لاہور ۱۹۹۵ء

☆ محمد مجیب۔ دنیا کی تاریخ سٹی بک پوائنٹ کراچی ۲۰۰۹ء

☆ محمد مجیب۔تاریخ تمدنِ ہند قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی ۱۹۹۹ء

☆ وزیر آغا، ڈاکٹر۔ مضمون ثقافت، ادب اور جمہوریت' مشمولہ ''کلچر'' از اشتیاق احمد (مرتب) بیت الحکمت لاہور ۲۰۰۷ء

☆ ول ڈیوراں۔(مترجم: تنویر جہاں) انسانی تہذیب کا ارتقا (حصہ: اول) مکتبہ فکر و دانش لاہور ۱۹۸۹ء

☆ یحیٰ امجد۔تاریخِ پاکستان: قدیم دور سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۹ء